میری گواہی

سیاست، تمدن، مذہب اور معاشرت کے تناظر میں انسانی
زندگی کے مقاصد کو آشکار کرتی ہوئی سچی گواہی، جو یقیناً
آپ کی زندگی کو بدل کر رکھ دے گی

ابنِ صلیبی (بشیر جَون)

میری گواہی

مصنف

بشیر جَون ابنِ صلیبیؔ

ایم اے (فلسفہ)، کراچی یونیورسٹی، کراچی

ایم ٹی ایچ (مسیحی علمِ الٰہیات)، این سی سی، لاہور

ناشرین

نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف بلیکل اسٹڈیز، کراچی

جملہ حقوقِ اشاعت غیر محفوظ ہیں
کتاب کو بِلا اجازت کسی بھی فارمیٹ میں دوبارہ شائع کیا جا سکتا ہے

نام کتاب

میری گواہی

مصنف

بشیر جَون ابنِ صلیبیؔ

ایم اے (فلسفہ)، کراچی یونیورسٹی، کراچی
ایم ٹی ایچ (مسیحی علمِ الٰہیات)، این سی سی، لاہور

ہدیہ

حسبِ توفیق

مصنف کا رابطہ

+92-343-3210787

+92-302-2347657

ebnesalibi@hotmail.com

nibspakistan@gmail.com

انتساب

اپنے مرحوم والدین

نانک منگل

اور

وِیرابی بی

کے نام

کہ جن کی شفقت و محبت کے دریا سے میں پوری طرح سیر نہ ہو پایا

اور

خدا نے انہیں اپنے پاس بُلا کر

مجھے اس احساسِ محرومی میں والدین کی قدر و قیمت کا

شدید احساس دِلایا

مصنف

مقام: بہاءالدین زکریاہ یونیورسٹی، ملتان

فہرستِ مندرجات

پیشِ لفظ

ابتدائی حالات

بے مول کی شہرت

جھونپڑیوں میں رہایش

ایک درزی پر قبولِ اسلام کا الزام

صحافت میں دلچسپی

پاسٹر شپ کا فیصلہ

بائبل اسکول میں

ماہنامہ ساون اور ڈیوڈ عرفان

یتیمی کا تجربہ

1998ء کا سانحہ

لاہور کالج آف تھیالوجی

کار والی سے دوستی

دو نوجوانوں کا قتل

سنگِ شہادت کا مسئلہ

چرچ کی رجسٹریشن

چرچ بلڈنگ کی فروخت کا مفروضہ

میرے مسلمان ہونے کی حقیقت

ملتان کی طرف کوچ

لاہور کی طرف ہجرت

کراچی واپسی
کینٹ اسٹیشن کراچی تا سٹی اسٹیشن لاہور
پاسٹر موسیٰ مسیح
داروغہ والا کی طرف منتقلی
میں نے کلیسا کیوں چھوڑا؟
بچوں کی کراچی واپسی
ایم اے کے امتحانات
لاہور میں مشکلات
کراچی کی طرف واپسی
موٹر سائیکل کی نیلامی
غربت و افلاس کی وحشت
بھائیوں سے ملاپ کی کوشش
بے انصاف قوم سے امید اور مایوسی
الزامات اور جوابات
مایوسی کے ایام
بائبل کا پنجابی ترجمہ
کورونا وائرس اور لاک ڈاؤن
آسمان کی ہولناک خاموشی
بچوں سے لاتعلقی اور ملتان کی طرف سفر
سفر کی پہلی رات اور یسوع سے ملاقات
سفر کی دوسری رات اور یسوع سے ملاقات
یسوع سے تیسری ملاقات

ملتان میں قیام کے روز و شب

اے ربی! تو کیا چاہتا ہے؟

کراچی واپسی کا منصوبہ

زندگی کا مقصد

ہمہ گیر اصولِ حیات

پیشِ لفظ

جب ایک سائنس دان کوئی شئے دریافت یا ایجاد کرتا ہے تو وہ ایک مخصوص تجرباتی عرصہ اور طریقہ کے تحت اپنی دریافت یا ایجاد کے لئے کچھ شرائط وضع کرتا ہے۔ یہ شرائط اس ایجاد یا دریافت کی حدود و قیود اور ہستی کے لئے ناگزیر ہوتی ہیں۔ اگر اس شئے کو ان شرائط کی پابندی کئے بغیر استعمال کیا جائے تو وہ شئے مناسب طور پر کام نہیں کر سکتی۔ نہ ہی کوئی شئے اپنے موجد کے ٹھہرائے ہوئے اصولوں کے خلاف از خود کار آمد ہو سکتی ہے۔ اسے ٹھیک انہی اصولوں کے تحت کام کرنا پڑے گا، جن کو اس کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ بالکل اسی طرح انسان کے لئے کیا مفید ہے، اور کیا مضر؟ اس کا فیصلہ انسان از خود کرنے کے قابل نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ وہ ان اصولوں کے مطابق زندگی نہ گزارے، جو اس کے خالق کی طرف سے اسے ہدایت کئے گئے ہیں۔

خدا نے انسان کی تخلیق کے وقت ہی کچھ اصول اس کی فطرت میں مقرر کر دیئے تھے۔ یہ بنیادی یا بدیہی اصول کہے جا سکتے ہیں۔ ان اصولوں کو اول اول تو خدا نے زبانی طور پر یاد دہانی کے لئے انسان کو دیا، پھر جب انسان کی تعداد بڑھتے بڑھتے زمین کے مختلف خطوں میں آباد ہو گئی تو اس نے ہر گروہِ انسانی کی ہدایت و رہنمائی کے لئے چند برگزیدہ آدمیوں کو بھیجا، جنہوں نے اس ہدایت کو نہ صرف زبانی سنایا بلکہ ان کو تحریری شکل میں بھی محفوظ کرنے کا اہتمام کیا۔ لیکن اس سے انسانوں نے اصل مقصد کو سمجھنے کی بجائے، اپنی اپنی شرائع کو ایک دوسرے پر فضیلت جتانے کے لئے استعمال کیا۔ یوں وہ تعصب و تناقص کی جنگ میں مبتلا ہو کر زمین کو اپنے ہی ہم جنسوں کے لہو سے سرخ کرنے لگ گئے۔ یہ عمل بجائے انسان کی تعمیر و ترقی کے، تضحیک و تخریبِ انسانیت کا موجب بن گیا۔

تب خدا نے ایک ایسی شخصیت کو بھیجا، جس نے انسان کی فطرت کی اصلاح کی، اور فلاحِ انسانیت کے ان بنیادی اصولوں کو کھول کھول کر بنی نوع کے سامنے پیش کیا، جن کی بنیاد پر تمام اقوامِ عالم کی ہدایت و رہنمائی کا دار و مدار ہے۔ یہ شخصیت یسوع تھا، جس نے انسان کو سکھایا کہ ظاہر کی بجائے باطن کی درستی پر توجہ دینا چاہئے۔ وضعی کی بجائے بدیہی اصولوں کی پیروی کرنا چاہئے۔ بیلوں، بھیڑوں اور بکروں کی قربانی چڑھانے کے بجائے، تعمیلِ احکام کی کوشش کرنا چاہئے۔ اس نے سکھایا کہ انسان کی اصل معراج اس دنیا کی سطوت و ملوکیت یا آرام و آسایش میں ہرگز نہیں۔ بلکہ اپنے ہم جنسوں کی سہولت و مدارت میں ہے۔ اس نے سکھایا کہ جذبہِ انتقام و تشدد کی بجائے عفو و درگزر میں کتنی طاقت مضمر ہے۔ اس نے بتایا کہ امنِ عامہ کے لئے جنگ کی بجائے صلح سے کیا نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ اس نے شریعت کے عارضی قوانین کی بجائے بدیہی اور مستقل اصولوں کی پیروی پر زور دیا، اور انسان کی باطنی اصلاح کو زیادہ اہمیت دے کر تخلیقِ انسانی کے اصل مقاصد کو واضح کر دیا۔

زیرِ نظر تحریر یسوع کی تعلیمات کے اسی پہلو پر رشنی ڈالتی ہوئی ایک سچی گواہی پر مشتمل ہے۔ یہ "میری گواہی" ہے۔ گواہی کا مطلب یوں تو "شہادت"، اور "تصدیق و تائید" ہے۔ لیکن مذہبی زبان میں اس کے اصطلاحی معنی یہ ہوتے ہیں کہ "وہ روحانی تجربہ، جو حیاتِ انسانی میں خدا کی مداخلت سے ظہور پذیر ہوتا ہے"۔ گواہی حقیقتاً ایک "شخصی اور ذاتی تجربہ" پر مبنی ہوتی ہے۔ اس میں کسی انسان کی ذاتی زندگی کا وہ بیان قلم بند ہوتا ہے، جس کا مقصد کسی الٰہی منصوبے کی نشان دہی کرنا ہو۔ یعنی وہ منصوبہ، جو خاص طور پر خدا نے کسی فردِ واحد کی زندگی میں پورا کرنا ہو۔ ایسی گواہی اگرچہ ہمہ گیریت کی حامل نہیں ہوتی، لیکن اس سے کسی ایک انسان کی زندگی کے مقاصد ضرور واضح ہو جاتے ہیں۔ بلکہ اس سے اکثر دوسرے بہت سے لوگوں کو اپنی زندگی کے مقصد پر غور و فکر کرنے کی تحریک ملتی ہے، اور یوں کئی زندگیاں خدا کے ہاتھ کے نیچے آجاتی ہیں۔

میرا ہرگز یہ دعویٰ نہیں کہ میری گواہی "تاریخِ مکاشفات" میں کوئی نئی اور بے مثال شئے ہے۔ نہ ہی میرا یہ دعویٰ ہے کہ میری گواہی کوئی نیا مکاشفہ ہے۔ بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ میری گواہی کم از کم میرے جیسے حالات کا تجربہ رکھنے والے لوگوں کے لئے ایک آئینہ ہے، جس میں وہ اپنی صورت دیکھ کر خود پر غور کر سکتے ہیں۔ میں خداوندِ کائنات کا بہت شکر گزار ہوں کہ اس نے ایسے وسائل پیدا کئے، جن سے میں نے خود کو زندہ خدا کے ہاتھوں کے نیچے محسوس کیا ہے۔ یقیناً ایسے وسائل ہر شخص کے لئے موجود ہیں، اور کوئی بھی ان سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی ذات اور اپنے کردار کی اصلاح کر سکتا ہے۔ اس طرح ہر شخص کے لئے خدا سے ایک ذاتی اور شخصی تعلق کی راہ نمودار ہوتی، اور اسے اپنے اصل مقصدِ حیات کی طرف بڑھنے میں مدد فراہم کرتی ہے۔

آخر میں صرف اتنا عرض کرنا چاہوں گا کہ اگر آپ یہ ایمان نہیں رکھتے کہ خدا آج بھی انسانی زندگی میں مداخلت کرتا ہے، تو پھر آپ کو پہلے خدا کے موجود ہونے پر ایمان لانے کے لئے ایک روحانی تجربہ کی خواہش کرنا چاہئے۔ لیکن اگر آپ خدا کے وجود پر ایمان رکھتے ہیں، تو پھر میری گواہی پر یقین کرنے میں کسی عذر کی گنجایش باقی نہیں رہتی۔ کسی روحانی تجربے کی جزئیات سے اختلاف ممکن ہے، لیکن اس کے امکان سے اختلاف دہریت کی دلیل ہے۔ اسی طرح ہر شخص کا تجربہ بالکل ایک نجی معاملہ ہوتا ہے، جس کا مقصد فرد کی باطنی اصلاح ہے۔ اس میں یہ امر شامل نہیں کہ اس میں اسے "علمِ الٰہیات کے اسرار و رموز" کی سمجھ عطا کی جائے۔ علمِ الٰہیات کے اختلافات کی نوعیت ایک فرق شئے ہے، جو مطالعہ و مشاہدہ سے تعلق رکھتی ہے۔ جبکہ روحانی تجربہ صرف ایک ہی بار ہونے والا ایسا واقعہ ہے، جس میں بندہ صرف اپنے خدا کے موجود ہونے اور اپنا اس کے ساتھ شخصی تعلق استوار کرنے کی راہ پاتا ہے۔ تعلیماتِ الٰہیات سیکھنے یا سمجھنے کے لئے اسے بار بار کسی روحانی تجربے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کا انحصار اس کی ذہنی، علمی و فکری حالت پر ہے۔ لہٰذا میں یہاں یہ عرض کرنا فرضِ اولین سمجھتا ہوں کہ آپ میری گواہی کے دوران اس مسئلہ سے قطعِ نظر کریں کہ میرے عقائد کیا ہیں۔ عقائد وقت کے ساتھ ساتھ ترتیب پاتے ہیں، اور ان کی حیثیت جزوی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ عقائد ہی کی بنیاد پر سب سے زیادہ خون خرابہ ہوا ہے۔ کیونکہ عقائد کو

سمجھنے اور قبول کرنے کے لئے ہر انسان کی ذہنی حالت ایک دوسرے سے فرق ہوتی ہے، اور اس کے لئے بعض اصطلاحات کو سمجھنا بھی انتہائی ضروری ہوتا ہے، جن میں کسی عقیدے کا تانا بانا بُنا ہوتا ہے، اور پھر مختلف علوم و فنون کی مبادیات سے جان کاری بھی لازمی ہے، جن کی مدد سے کسی عقیدے کو جزوی یا کلی طور پر واضح کرنے کی ضرورت ناگزیر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخِ مکاشفات میں جتنے لوگوں کو بھی روحانی تجربہ حاصل ہوا، انہوں نے عقائد وضع کرنے کی بجائے اپنے مقصدِ حیات اور خدا کے ساتھ تعلقات کی نوعیت کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ میری گواہی بھی ایک ایسی ہی کوشش ہے۔ اس میں آپ کو علمِ الٰہیات کے بھیدوں سے واقف کرانے کی کوشش نہیں کی گئی۔ نہ ہی کوئی ایسی مشکل اور فلسفیانہ زبان استعمال کی گئی ہے، جس کے لئے آپ کو کسی بڑی سی لغت کی طرف رجوع کرنا پڑے۔ یہ بالکل سادہ باتیں ہیں۔ ان کا تعلق روزمرہ کی زندگی کے ساتھ ہے۔ یہ باتیں کسی بھی فرد کی زندگی سے متعلق ہو سکتی ہیں، اور ان کا مفہوم بھی یکسانیت کا حامل ہو سکتا ہے۔ البتہ فرق صرف یہ ہے کہ کسی شخص کی زندگی میں یہ تجربہ جلد ہو جاتا ہے، اور کسی کی زندگی میں بدیر تاکہ وہ اپنے خدا کی طرف رجوع لائے اور اپنی زندگی کے مقصد کو سمجھتے ہوئے، اسکے مطابق گزارے۔

میری دعا ہے کہ خدا آپ کی زندگی میں مداخلت کرے، اور آپ کو آپ کی زندگی کا حقیقی مقصد و مدعا حاصل ہو جائے۔ اگر میری گواہی سے آپ کو کسی بھی طرح کی برکت ملے، یا آپ میں روحانی تجربے کی خواہش بیدار ہو جائے، اور آپ کا تعلق خدا کے ساتھ استوار ہو جائے، تو میں سمجھوں گا کہ مجھے اپنی گواہی کی تصنیف و تشہیر کا مقصد حاصل ہو گیا۔ اس کے علاوہ نہ تو مجھے شہرت کی طلب ہے اور نہ ہی کسی مالی مفاد کی غرض۔ نیز اپنے روحانی تجربے کی بنیاد پر مجھے ایسی کوئی خوش فہمی بھی نہیں کہ میں ان لوگوں سے بہتر و افضل ہوں، جن کو ابھی تک ایسا کوئی روحانی تجربہ حاصل نہیں ہوا۔

فقط

آپ کا روحانی بھائی

بشیر جَون ابنِ صلیبیؔ

مئی 2020ء، کراچی

ابتدائی حالات

میری تاریخِ پیدائش بمطابق کلیسیائی کاغذات 12 اکتوبر 1979ء ہے۔ لیکن یہ تاریخ میری آبائی کلیسیا کے ریکارڈ کے مطابق نہیں بلکہ میرے اپنے منتخبہ کلیسیائی گروہ فلڈلفیہ پینتی کاسٹل چرچ عیسیٰ نگری کراچی کے مطابق ہے۔ مجھے یاد اور معلوم نہیں کہ آیا یہ تاریخ میں نے خود لکھوائی تھی یا پادری اللہ دِتہ صاحب نے از خود لکھی تھی۔ البتہ میں اسی پر مطمئین ہوں اور یہی تاریخ میرے تعلیمی و غیر تعلیمی کاغذات میں بھی درج ہوتی رہی ہے۔

کراچی کی طرف ہجرت

میرے دادا جی کے چار بیٹے تھے، جن میں میرے والد نانک منگل دوسرے نمبر پر تھے۔ تایا جی کا نام ویرُو، اور چچاؤں کے نام بالترتیب عنایت مسیح اور ہدایت مسیح ہیں۔ والد صاحب 60ء کی دہائی میں کراچی کی طرف ہجرت کر آئے تھے۔ کیونکہ اس دوران یہاں کراچی میں روزگار کے مواقع زیادہ میسر تھے۔ والد صاحب نے فوری طور پر کراچی ڈویلپمنٹ اتھارٹی میں بطورِ خاکروب ملازمت اختیار کرلی۔ جلد ہی جمعدار اور پھر سپر وائزر بن گئے۔

بے مول کی شہرت

میں بچپن ہی سے بہت کم گو، سنجیدہ اور علم دوست رہا ہوں۔ میرے رشتہ دار اور آس پڑوس والے اس بات کی شہادت دے سکتے ہیں کہ میں نے گلی کوچوں میں کبھی وقت برباد نہیں کیا۔ بلکہ اکثر مجھے ہاتھوں میں کتابیں اٹھائے ہی دیکھا گیا۔ اس کی وجہ شاید یہ رہی تھی کہ میں اپنے والدین کی آخری اولاد ہوں، اور میرے ہوش سنبھالنے تک تقریباً سب بہن بھائی اپنی اپنی خانگی زندگی میں مصروف ہو چکے تھے۔ میں تنہائی کو مٹانے کی غرض ہی سے شاید کتابوں کے ساتھ مانوس ہوتا گیا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں ہنوز پانچویں جماعت کا طالبِ علم تھا، تو مجھے اشعار سے دلچسپی ہو گئی۔ اس کے لئے میں نے شاعری کی کتب خریدنا شروع کر دیں۔ پھر رفتہ رفتہ اشعار بھی کہنا شروع کر دیئے۔ اس سے مجھے نہ صرف اپنے اسکول

میں بلکہ اپنے علاقے میں بھی شہرت ملنا شروع ہو گئی۔ اگرچہ میں بچپن سے ایک مستقل چھت اور بعض مادی وسائل کے حوالے سے بہت محروم رہا ہوں، لیکن اس مفت میں ملنے والی شہرت نے مجھے بہت حد تک مطمئین کر دیا تھا۔ 1993ء تک کراچی کے کئی شاعروں کے ساتھ میرے رابطے قائم ہو چکے تھے، جن میں جناب آزاد مبارک، شریف سوزؔ ڈسکوی (جنہوں نے باقاعدہ شعری اسرار و رموز سیکھنے کے لئے میری حوصلہ افزائی کی، اور جناب اے آر ناظمؔ مرحوم سے ملاقات کا شرف دلایا۔ شریف سوز صاحب ہی وہ شخصیت تھے، جن سے میں نے خطاطی کا ہنر بھی سیکھا)، عارف پرویز نقیب، سہیل ساجد سٹونز آبادی، جانسن منشا، بے پے عدیدؔ، اعظم پرویز اعظمؔ، ریاست ارشاد انسان، محبوب عالم ہنر اور اسی طرح کئی دیگر شخصیات، جن کے نام اس وقت مجھے یاد نہیں، شامل ہیں۔

میری شاعری اکثر و بیشتر مذہبی موضوعات پر مبنی ہوتی تھی۔ میں زیادہ تر روحانی و اخلاقی مضامین کو باندھنے کی کوشش کرتا تھا، اور شاید یہی وجہ تھی کہ میں روایتی مشاعروں میں اتنی پذیرائی حاصل نہ کر سکا۔ لہٰذا جب ان مشاعروں کی خبریں اخبارات میں شائع ہوتیں، تو بعض خبروں میں شعراء کی فہرست میں میرا نام شائع نہیں کیا جاتا تھا۔ میں نے اسے حسد سمجھا، اور اپنی منظومات کو تنقیدی موضوعات سے آراستہ کرنا شروع کر دیا۔ اس پر مجھے مزید مایوسی ہوئی، اور چند شعراء اور صحافیوں سے میرے تعلقات بگڑنا شروع ہو گئے، جن میں جناب آر تھر برکی آر تھر اور اعظم پرویز اعظم صاحب کے اسماء قابلِ ذکر ہیں۔ اب مجھے مشاعروں میں کم کم ہی مدعو کیا جاتا تھا۔ تاہم میں نے ہمت نہ ہاری اور مشقِ سخن کو جاری رکھتے ہوئے اپنے موضوعات کو وسعت دینا شروع کر دی۔ اس طرح میں مشاعروں سے نکل کر اخبارات، رسائل و جرائد اور مسلم شعراء کے مشاعروں تک پہنچ گیا، جہاں میری رسائی جناب سید کامی شاہ کے توسط سے ہوئی۔ کامی شاہ ایک فلسفی شاعر ہے۔ میری شاعری میں فلسفیانہ رجحانات کے لئے کامی شاہ محرک بنے۔ البتہ اس کے ساتھ ساتھ میں علامہ اقبال کی شاعری کو بھی سمجھ رہا تھا، جس کا اثر بہت دیر تک مجھ پر غالب رہا۔

جھونپڑیوں میں رہائش

89ء تک کے واقعات زیادہ تر میرے ذہن سے محو ہو گئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ 79ء سے 89ء تک میری عمر کوئی دس سال بنتی ہے۔ یہ دور میرے لڑکپن کا تھا، اور زیادہ تر عام لڑکوں کی طرح گزرا۔ والدین اور بہن بھائیوں کی طرف سے کوئی قابلِ ذکر رویہ کا اظہار نہیں ہوا۔ ویسے بھی اس دوران معاشرے میں کوئی قابلِ ذکر انقلابی تبدیلیاں رونما نہیں ہو رہی تھیں۔ لہٰذا یہ دور "دورِ فراموشی" کہا جا سکتا ہے۔

البتہ 1990ء کے اوائل میں اچانک میرے والدین گلشنِ اقبال کراچی میں گیلانی ریلوے اسٹیشن کے قریب واقع ایک جھونپڑپٹی میں منتقل ہو گئے۔ میرے والد صاحب کو گائیں پالنے کا شوق تھا۔ وہ ہر سال دو تین گائیں عیدِ قرباں کے لئے پالتے اور بیچ کر سال بھر کے اخراجات نکال لیتے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس کام میں بڑے بھائیوں کا کردار کہاں تک ملوث تھا۔ البتہ وہ بھی عیدِ قرباں سے چند دن پیشتر والد صاحب کے ساتھ کچھ متحرک نظر آ جاتے تھے۔ باقی کا سارا سال میں ان جھونپڑیوں والی بستی میں اپنے والد اور والدہ کے ساتھ تنہا گزارتا۔ یہ عرصہ 1993ء تک کا بنتا ہے کہ میں عیسیٰ نگری سے دور اپنے اعزاء واقرباء اور دوستوں سے الگ تھلک ایک نامانوس معاشرت میں رہا۔

پھر 1993ء کے کسی ماہ میں یہاں زمین کے تنازعے کے باعث دو سیاسی گروہوں میں تصادم ہوا۔ فائرنگ ہوئی، اور اس کے بعد دوسرے دن صبح پولیس آ گئی۔ پولیس میرے والد صاحب کا پوچھنے لگی۔ وہ گھر پر نہیں تھے۔ پولیس اہلکار مجھے اٹھا کر لے گئے۔ تھانہ گلشن اقبال پہنچا تو وہاں شام تک محبوس رکھا گیا۔ غروبِ آفتاب تک میرے والد صاحب اور بڑے بھائی مجھے رہا کروا کر لے گئے۔ اس وقت میری عمر تیرہ چودہ سال تھی۔ مجھے اس سارے معاملے کی کوئی خاص سمجھ نہیں آئی، کہ آخر ہوا کیا۔ لیکن اب کچھ کچھ سمجھ آنا شروع ہو گیا ہے۔

اس واقعہ کے بعد ہم پھر عیسیٰ نگری واپس آ گئے۔ لیکن یہاں گلی نمبر 7 میں واقع گھر سے مجھے کوفت ہونا شروع ہو گئی تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ میرا کوئی بھی گھر نہیں ہے۔ کیونکہ میں یہاں مستقل نہیں رہ پا رہا تھا۔ مہمانوں یا مسافروں کی طرح یہاں آنا جانا بنا ہوا تھا۔ جتنے دن یہاں رہنے کا موقع میسر آتا، بڑی بھابھی کی طرف سے گھر، گھر کی بجائے ایک سرائے بن جاتا۔ دراصل وہ ہمارے یہاں رہنے پر مانع تھی۔ اس نے ایسا ایسا کہرام بپا کیا کہ خدا کی پناہ۔ میری والدہ کے ساتھ تو شاید اس کی کوئی ازلی دشمنی تھی۔ گالی گلوچ کرنا اس کا معمول تھا۔ آتے جاتے راہداری پر تھوکنا، کچرا پھینک دینا، اور پھر اس کا بہانہ بنا کر لڑائی کا پہلو نکال لینا اس کا روز روز کا مشغلہ تھا۔ بس یہی وجوہات تھیں کہ میں احساسِ محرومی کا شکار ہوتا گیا۔ میں سوچتا کہ سب بھائیوں نے اپنا اپنا الگ چھت تقسیم کر لیا ہے، لیکن میرے لئے کچھ بھی موجود نہیں۔ چند اچھے رشتے محض اسی وجہ سے چھوٹ گئے کہ لڑکے کا اپنا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ میری بھابھی لڑکی والوں سے کہتی کہ یہ جگہ تو میرے خاوند کی ہے۔

ایک درزی پر قبولِ اسلام کا الزام

1992ء یا 1993ء کے دوران عیسیٰ نگری کراچی میں جناب شاہد ساگر صاحب نے "کرسچن یوتھ کونسل" کے نام سے ایک تنظیم بنائی، تو مجھے اس کا پریس سیکریٹری منتخب کیا گیا۔ اس انتخاب کی وجہ غالباً یہی تھی کہ میں علم و ادب سے وابستہ

تھا۔ خیر اس تنظیم کی تشکیل کے بعد جو پہلی سرگرمی دیکھنے میں آئی، اس میں ایک ایسا مسئلہ اٹھایا گیا تھا، جس کا تعلق دو مذاہب کے درمیان تصادم تھا۔ ہوا یوں کہ گلی نمبر 3 میں ایک مسیحی درزی کی دکان تھی۔ واللہ اعلم وہ مسلمان ہوا تھا کہ نہیں، البتہ اس کے متعلق یہ خبر مشہور ہو گئی کہ اس نے مسیحیت کو ترک کر کے اسلام قبول کر لیا ہے۔ یہ پہلا واقعہ تھا، جس میں میں نے مسیحیوں کے مذہبی جذبات کا مشاہدہ کیا تھا۔ مذہب کے معاملے میں تو خود میں بھی بہت سنجیدہ اور وفادار تھا۔ لیکن میں کسی دوسرے مذہب کے پیروکار سے نفرت کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ یہاں صورتحال ایسی تھی کہ اجلاس بلائے جا رہے تھے، اور نوجوانوں کو اس درزی کے خلاف ابھارا جا رہا تھا۔ آخر کار وہ درزی اپنی دکان اونے پونے میں بیچ کر عیسیٰ نگری سے ہجرت کر گیا۔ اس کے بعد نہ میں اس تنظیم کو وقت دے سکا، اور نہ ہی یہ تنظیم فعال رہی۔

مجھے اس درزی کے ساتھ کئے گئے ظلم کا علم 2014ء میں ہوا، جب شاہد ساگر صاحب نے میرے خلاف ایک ایسی ہی خبر شائع کر کے مجھے چرچ، گھر اور کاندان و برادری سے محروم کر دیا۔

صحافت میں دلچسپی

شاہد ساگر صاحب میرے والد کے دوست تھے، اور میری والدہ کے بھائی بنے ہوئے تھے۔ میں ان کو ماموں کہہ کر مخاطب کیا کرتا تھا۔ وہ بھلے وقتوں کے بی اے، اردو فاضل اور صحافت میں سرگرم تھے۔ ان کے کالم اکثر روزنامہ خبریں میں چھپتے رہتے تھے۔ ان کی شخصیت میرے لئے بڑی معزز تھی۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے ان کی طرف سے دی گئی ذمہ داری کو فوراً قبول کر لیا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ مجھے بھی صحافت کا شوق ہوا، اور میں نے فوٹو کاپی کی صورت میں ایک چند صفحاتی جریدہ "ہللویاہ" کے نام سے جاری کرنا شروع کر دیا۔ اس کے غالباً دو شمارے فوٹو کاپی کی صورت میں بنائے، اور حلقۂ احباب سے داد و تحسین حاصل کی۔ لیکن یہ سلسلہ تواتر سے نہ چل سکا، اور میں نے بھی اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی۔

پاسٹر شپ کا فیصلہ

1990ء تا 1993ء مجھے عیسیٰ نگری سے دور رہنے کی وجہ سے ذاتی گھر کی محرومی کا شدت سے احساس ہوا۔ میرے والد صاحب بوڑھے ہو رہے تھے، اور جتنا کچھ وہ اپنے بڑھاپے سے پیشتر کر سکتے تھے، کیا اور بڑے بیٹوں میں تقسیم کر دیا۔ کبھی کبھی مجھے یہ خیال بھی آتا کہ میرا بڑا بھائی امیر نانک مجھے اس گھر سے دور رکھنا چاہتا ہے تا کہ میں جوان ہو کر اس میں سے اپنے حصے کا مطالبہ نہ کر لوں۔ دوسری طرف مسیحیت میں کوئی نظامِ فقہ موجود نہیں کہ والد کی جائیداد میں سے بیٹوں کے درمیان تقسیم کا تصفیہ کیا جا سکے۔ اس دوران میرے اندر ایک ذاتی چھت کی ضرورت کا احساس جاگنے لگا۔ میں اپنے چند ایک معاشقوں میں بھی اسی لئے ناکام ہو گیا تھا کہ بات اس سوال پر آ کر ختم ہو جاتی کہ "شادی کو خانہ آبادی کیونکر بنایا جا سکے گا؟"۔ آخر فیصلہ کیا کہ کسی سیمنری میں داخلہ لے لیا جائے۔ اس سے رہائش کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا، اور زندگی کے کچھ مزید سال بھی آرام سے گزر جائیں گے۔

اس فیصلے میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے مذہبی گروہوں اور اداروں سے تعلقات و رفاقت رکھنا ضروری تھا، لہٰذا میں نے علاقے کے سرگرم ترین نوجوانوں کے گروہ "بائبل اسٹڈی دعائیہ گروپ" میں شمولیت اختیار کر لی۔ اس گروپ کے روحِ رواں مبشر اختر رشید عرف لاڈو، اور مبشر افضل سیموایل صاحب تھے۔ یہاں میں نے بہت سرگرمی اور تحریک پائی۔ ایک دن گروپ میں ایک پاسٹر بنام جاوید جانسن اہل صاحب کو مدعو کیا گیا تھا۔ شومئیِ قسمت سے اس دن میں حاضر نہ ہو سکا۔ لیکن دوسرے دن پہنچنے پر معلوم ہوا کہ گروپ میں اس پاسٹر کے وعظ کو لے کر بڑی بحث و تکرار چل رہی ہے، اور ساتھی ایک دوسرے کو اس پاسٹر کی آمد کے لئے الزام دے رہے ہیں۔ یعنی اس پاسٹر کو وعظ کی دعوت دے کر جیسے کوئی بہت بڑی غلطی ہو گئی ہو۔ بعد ازاں معلوم ہوا کہ وہ پاسٹر عقیدۂ تثلیث کے خلاف تھا، اور اپنے وعظ میں کوئی "اونلی جیزز" نامی تعلیم کا پرچار کر کے چلتا بنا۔

میرے لئے یہ پہلا موقع تھا کہ عقیدوں کی جنگ کی طرف متوجہ ہوا۔ میں نے اس پاسٹر صاحب کی تلاش شروع کر دی۔ اس تلاش کے دوران میری ملاقات عزیز آباد کراچی کے ایک پاسٹر بنام روبن رازؔ صاحب سے ہوئی۔ یہ ملاقات مائیکل جاوید سابق ایم پی اے سندھ کے اسکول کمپاؤنڈ میں ہوئی، جہاں ایک بہت بڑے مذہبی اجتماع کا انعقاد کیا گیا تھا۔ اس کی تفصیل یوں ہے کہ جب اس اجتماع کے اشتہارات عیسیٰ نگری کے گلی کوچوں میں آویزاں کئے جا رہے تھے، تو گروپ کے دوستوں نے بتایا کہ اس اجتماع میں مت جانا، کیونکہ یہ "اونلی جیزز" والوں نے منعقد کیا ہے۔ یہ جان کر میں نے فیصلہ کیا کہ میں اس میں ضرور شرکت کروں گا، اور جانوں گا کہ آخر اونلی جیزز والے کیا مانتے اور سکھاتے ہیں۔ لہٰذا میں وہاں پہنچ گیا۔ ایک دو لوگوں سے بات کرنے پر مجھے پاسٹر روبن رازؔ صاحب سے ملوا دیا گیا۔ انہوں نے مجھے پاسٹر بہادر جارج صاحب کا رابطہ نمبر دے دیا، جو

کراچی میں اونلی جیزز والوں کے سربراہ تھے۔ دوسرے ہی دن میں نے بہادر جارج صاحب سے رابطہ کیا، اور ان کی تائید سے لاہور کے لئے رختِ سفر باندھنا شروع کر دیا۔ کیونکہ ان کا بائبل اسکول لاہور میں واقع ہے۔

بائبل اسکول میں

بہار کالونی کوٹ لکھپت میں "نیو لائف ٹریننگ سینٹر" کے نام سے اونلی جیزز والوں کی سیمنری ہے۔ میں جب یہاں پہنچا تو مجھے فوراً داخلہ مل گیا۔ لیکن ابھی میری ٹریننگ مکمل بھی نہ ہوئی تھی کہ مجھے اس سیمنری سے الگ ہونا پڑا۔ اس کی وجوہات دو تھیں۔ پہلی وجہ تو کلارک آباد کے چند لڑکے تھے، جو یہاں تمام طلباء پر اپنی فوقیت کا سکہ جمانے کے لئے سب پر رعب داب ڈال کر رکھنا چاہتے تھے۔ جبکہ دوسری وجہ خود میری اپنی پیدا کی ہوئی تھی۔ کیونکہ میں نے ان لڑکوں کی بدمعاشی کے نتیجے میں ہونے والی ایک لڑائی کی خبر ماہنامہ ساون لاہور میں شائع کرا دی تھی۔

ماہنامہ ساون لاہور اور ڈیوڈ عرفان

جب میں لاہور میں علمِ الٰہی کی تحصیل کر رہا تھا تو مجھے ماہنامہ ساون کے دفتر جانے کا خیال آیا۔ کیونکہ میں شعر و ادب سے بھی خاص لگاؤ رکھتا تھا۔ اس لئے ایک دن علاقے میں ساون کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ جلد ہی مجھے جناب ڈاکٹر ڈیوڈ عرفان صاحب سے شرفِ ملاقات نصیب ہو گیا۔ ان دنوں ماہنامہ ساون کا دفتر ان کے دولت خانہ ہی میں منتقل ہو گیا تھا۔ اس کی وجوہات کیا تھیں، اس وقت میری سمجھ میں نہ آئیں۔ البتہ ان سے ملاقات میرے لئے فخر و انبساط کا مقام تھا۔ وہ ایک سچے اور کھرے صحافی، شاعر، ادیب اور دانشور تھے۔ انہوں نے پاکستان میں مسیحی اقلیت کی سیاسی ترجمانی کے لئے ماہنامہ ساون کو جاری کیا، اور اس میدان کے ہراول تسلیم کئے گئے۔

جب بشپ جان جوزف کی شہادت کا واقعہ رونما ہوا، تو ڈیوڈ عرفان صاحب نے اپنے رسالے میں میرے بھی دو تین قطعات شاملِ اشاعت فرمائے۔ غالباً یہ پہلا موقع تھا کہ میری آواز اور میرا نام کسی مستند مسیحی جریدے میں شائع ہوئے۔

ڈیوڈ صاحب سے واقفیت تو ہو چکی تھی، اب میں اکثر بائبل اسکول کی مصروفیات کے بعد ان کی طرف چلا جایا کرتا تھا۔ ایک دن انہوں نے مجھے کہا کہ بائبل کے ساتھ ساتھ اپنی عام تعلیم کو بھی آگے بڑھاؤ۔ کیونکہ اس وقت تک میں صرف مڈل پاس تھا۔ انہوں نے مجھے چند سو روپے دیئے اور میٹرک کی کتابیں خریدنے کی ہدایت کی۔ میں نے کتابیں خرید کر پڑھنا شروع کر دیں۔ یہاں اس بات کا تذکرہ کرتا چلوں کہ پنجاب بورڈ کا نصاب سندھ بورڈ کے نصاب سے قدرے مشکل ہے۔ اگرچہ میں لاہور میں میٹرک اور بائبل ٹریننگ کو مکمل نہ کر سکا۔ لیکن اس سے کم از کم یہ ہوا کہ میرے اندر مزید حصولِ تعلیم کی جستجو بڑھتی گئی۔ اس کے لئے میں جناب ڈیوڈ عرفان صاحب کا تہِ دل سے شکر گزار ہوں۔

یتیمی کا تجربہ

ابھی مجھے سیمنری سے نکالا نہیں گیا تھا کہ فروری 1997ء کو میرے والد صاحب انتقال کر گئے۔ جب میں لاہور میں تھا، تو میرے والدین بھی کراچی سے فاروق آباد منتقل ہو گئے تھے۔ ان کے یہاں آنے کی وجہ یہ ہوئی تھی کہ میرے سب سے بڑے بھائی جناب امیر نانک صاحب اپنے دونوں بڑے بیٹوں کو مشن احاطہ، فاروق آباد سے تعلیم دلوانے کے خواہش مند تھے۔ لیکن بچوں کو ہاسٹل میں رہنے کی اجازت نہیں مل رہی تھی۔ لہٰذا فیصلہ یہ ہوا کہ بچوں کو ان کے دادی دادا کے ساتھ مشن احاطہ کے قریب کرائے پر گھر دلوا کر اس مقصد کو حاصل کیا جا سکے۔ میرے والدین بزرگ ہو چکے تھے، اور اب ان کے معاملاتِ حیات کا زیادہ تر انحصار بڑے بھائی امیر نانک ہی پر تھا۔ اس وجہ سے والدین کسی انکار کے بغیر فاروق آباد آ گئے۔

میں لاہور میں تھا، اس لئے اکثر چھٹی کے ایام میں والدین سے بھی مل کر آ جایا کرتا۔ لیکن باقی کے ایام میں ضروریاتِ زندگی کے لئے میرے والد صاحب کو اکیلے ہی بھاگ دوڑ کرنا پڑتی۔ ایک روز وہ جلانے کے لئے لکڑیاں لے کر آ رہے تھے کہ شدید گرمی اور پیاس کی وجہ سے ان کی حالت غیر ہو گئی اور بروقت کسی طرح کی امداد نہ ملنے کے باعث ان کی حرکتِ قلب بھی بند ہو گئی۔

رات تک مجھے اس واقعے کی کوئی اطلاع نہ مل سکی۔ البتہ صبح ناشتے کے وقت سیمنری کے ایک سینئر طالبِ علم نے مجھے کہا کہ "تم آج چھٹی کر کے فاروق آباد چلے جاؤ۔ کیونکہ تمہارے والد کی طبیعت بہت خراب ہے"۔ اس کے لہجے سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ اس لئے میں نے زور دے کر اس سے پوچھا کہ بھائی صحیح بتاؤ کیا بات ہے؟۔ تو وہ خاموشی سے نظر جھکا کر کہنے لگا کہ "بس آپ ناشتہ کرو، اور چلے جاؤ"۔ میں اس کی اس پر اسراریت پر رو پڑا۔ اس نے آگے بڑھ کر مجھے گلے سے لگا لیا، اور تسلی دیتے ہوئے کہا کہ "پلیز! خود کو سنبھالو، اور خیریت سے جلد پہنچ جاؤ"۔

1998ء کا سانحہ

سیمنری اور میٹرک کا خواب خاک میں مل چکے تھے۔ میں کراچی واپس آ چکا تھا۔ لیکن اب میں پہلے والا شخص نہیں تھا۔ اب میں ایک خود انحصار آدمی کے مقام کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میرے والد صاحب فوت ہو چکے تھے۔ والدہ کراچی واپس آ چکی تھیں، اور گلی نمبر 7 والے پرانے گھر میں رہایش پذیر تھیں۔ میری واپسی پر والدہ کو قدرے تسلی حاصل ہو چکی تھی۔ لیکن اب وہ میری فکر میں لگ گئیں۔ مجھ سے اکثر کہتیں کہ بیٹا! اب تمہاری شادی ہو جانی چاہئے۔ کیونکہ وقت بہت بے رحم ہے۔ تمہارے باپ کو موقع نہیں مل سکا کہ تمہاری شادی کی ذمہ داری نبھا سکے۔ اس لئے میرا ابھی کچھ پتہ نہیں۔ لہٰذا کوئی لڑکی پسند کرو اور مجھے بتاؤ۔ اس دوران میری ترجیحات بدل چکی تھیں۔ میں نے سب سے پہلا مسئلہ جو والدہ کے سامنے رکھا، وہ تھا "میرا گھر"۔ جس کے لئے والدہ نے بڑے بھائی سے بات کی۔ بھائی نے پہلے تو کہا کہ یہ گھر ہم سب کا مشترکہ ہے، اس لئے فکر کی کوئی بات نہیں۔ تاہم جب بھابھی نے والدہ سے لڑائی جھگڑا شروع کیا، تو پھر وہ الگ گھر دینے کے لئے سوچنے لگا۔ جس پر میں نے بھی شادی کے ارادہ کو التوا میں ڈال دیا۔

ان دنوں عیسیٰ نگری میں منشیات فروشی اپنے عروج پر تھی۔ آئے دن پولیس اور منشیات فروشوں کی آنکھ مچولی کھیلی جا رہی تھی۔ بعض اوقات تو پولیس بے گناہ راہ گیروں کو بھی اٹھا کر لے جاتی، اور بغیر رشوت لئے نہیں چھوڑتی تھی۔ علاقے کے کچھ معززین نے اس مسئلے کے حل کے لئے غور و فکر شروع کر دیا۔ اس وقت نواز شریف حکومت نے عوامی مسائل کی روک تھام کے لئے "خدمت کمیٹی" کے نام سے بستیوں اور محلوں میں تنظیم سازی شروع کر دی، تو عیسیٰ نگری میں محترمہ نذیر بیگم مرحومہ کے زیرِ نگرانی ایک دفتر قائم کیا گیا، جس میں مجھے جوائنٹ سیکریٹری کے طور پر منتخب کر لیا گیا۔

ایک روز دو پولیس اہلکار گشت پر تھے، جنہوں نے منشیات فروشوں سے مڈبھیڑ پر اسٹریٹ فائرنگ کر دی، جس سے دو راہ گیر زخمی ہو گئے۔ اس حادثے نے مجھے سیاسی شعور عطا کیا۔ میں نے پولیس کا تشدد برداشت کیا، اور منشیات و فروشوں کے خلاف مہم شروع کر دی۔

میرے سامنے سوشل میڈیا اس وقت ایک مؤثر ذریعہِ ابلاغ تھا۔ فرینڈ لسٹ میں ہر شعبہِ حیات سے متعلق لوگ موجود تھے۔ پاکستان سے بھی اور پاکستان سے باہر کی دنیا سے بھی۔ لہٰذا میری آواز پوری دنیا میں سنی جا سکتی تھی، اور سنی گئی۔

2006ء تک فیس بک (facebook) کے ذریعے مجھے سوشل میڈیا پر اچھی خاصی شہرت حاصل ہو چکی تھی۔ میں نے شاعری کے ساتھ ساتھ مذہبی، سیاسی و سماجی موضوعات پر بھی کھل کر لکھا۔ 2014ء تک میں نے بیرونِ کراچی کئی تبلیغی دورے صرف سوشل میڈیا پر ملنے والے دعوت ناموں کے ذریعے کئے۔ اتنی شہرت اور عزت پانے کے باوجود میں علاقائی سطح پر چند سماجی مسائل کا بہت بری طرح شکار تھا۔ مجھے معلوم نہیں کہ میں نے کبھی کسی کو کوئی تکلیف پہنچائی ہو، تاہم چند لوگوں کی

طرف سے مجھے شدید ذہنی و جسمانی ایذا رسانی کا سامنا کرنا پڑا۔ میں بہت دکھ میں مبتلا ہوا۔ کیونکہ میرے لئے تو یہی دکھ سنبھالا نہیں جا رہا تھا کہ میرے سارے بھائی تو اپنی اپنی چھت کے تلے سکون سے زندگی گزار رہے ہیں، لیکن میں بے گھری کا شکار ہوں۔ اس لئے جب علاقے میں چند سیاسی و سماجی اور مذہبی افراد کی طرف سے مخالفت و مخاصمت کا سامنا کرنا پڑا تو دل مزید رنجیدہ ہو گیا۔ یہ علم مجھے بہت بعد میں ہوا کہ دراصل ایم کیو ایم اور پیپلز پارٹی کے سیاسی مسیحیوں نے مجھ سے "سنگِ شہادت" نصب نہ کرنے پر بدلہ لینے کی ٹھان رکھی ہے۔

لاہور کالج آف تھیالوجی

2010ء میں جب بشپ آزاد مارشل صاحب نے رائے ونڈ روڈ پر لاہور کالج آف تھیالوجی کا آغاز کیا تو میں یہاں بالکل ابتدائی (Pioneer) طلباء میں سے ایک تھا۔ یہاں مجھے آنجہانی ریورنڈ پروفیسر کینن جیرالڈ مل صاحب کے ذریعے داخلہ مل گیا۔ لیکن پرنسپل جناب عمانوایل بہادر صاحب کی عدمِ غیر جانب داری کے باعث مجھے آٹھ ماہ کے محدود عرصے میں کالج سے نکال دیا گیا۔

ہوا یوں کہ طلباء کو ٹھوکر نیاز بیگ کے قریب لاہور یونیورسٹی کے سامنے والی گلی میں ایک مختصر سا ہاسٹل فراہم کیا گیا تھا۔ یہاں کراچی سے صرف دو طلباء تھے۔ باقی دو طلباء کا تعلق پنجاب ہی سے تھا، جن میں ایک شفقت گل صاحب تھے، جن کا تعلق سرگودھا سے اور دوسرے جناب کاشف کمال صاحب، جن کا تعلق سیالکوٹ سے تھا۔ شفقت گل کی عادت یا شاید ذمہ داری یہ تھی کہ وہ ہاسٹل کی لمحے لمحے بھر کی رپورٹ پرنسپل صاحب کو پہنچاتے تھے۔ جس کا انکشاف دورانِ جماعت پرنسپل صاحب کی باتوں سے ہو جاتا تھا۔ پرنسپل صاحب جن مجہول باتوں کا ذکر کرتے، عموماً وہ ہاسٹل کی چار دیواری میں مجھ سے تعلق رکھتی تھیں۔ اس لئے مجھے شفقت پر شدید غصہ آتا، اور پرنسپل صاحب کی اس حرکت پر بھی افسوس ہوتا۔ اس صورتحال نے مجھے بھی مجبور کر دیا کہ میں نے پرنسپل صاحب سے بے تکلفی اختیار کر لی، اور بعض اوقات دورانِ جماعت ان پر فقرہ بازی بھی کر دیا کرتا۔

ہمیں ٹھوکر نیاز بیگ سے کالج پہنچنے کے لئے جس سواری کی فوری طور پر دستیابی ہو سکتی تھی، اس میں ٹیوٹا ہائی ایس قابلِ ذکر تھی۔ لیکن اس کا مسئلہ یہ تھا کہ یہ گاڑی بہت چھوٹی تھی، جس میں صرف بیٹھ کر ہی سفر کیا جا سکتا ہے۔ اس میں کھڑے ہو کر سفر کرنا کمر کا درد مفت میں لینے والی بات تھی۔ یہ گاڑی عموماً ٹھوکر نیاز بیگ سے چلتے ہی بھری ہوئی ہوتی تھی۔ اس لئے اس میں جگہ کا ملنا محال ہوتا۔ شفقت کا قد چھوٹا تھا۔ وہ اس گاڑی میں جھک کر سفر کر لیتا، اور وقت پر بلکہ اکثر وقت سے پہلے

بھی پہنچ جایا کرتا۔ مجاہد کے پاس اپنی موٹر سائیکل تھی، جس پر وہ کاشف کو بٹھا کر چلا جاتا۔ پیچھے میں رہ جاتا، تو مجھے کسی بڑی گاڑی کا انتظار کرنا پڑتا۔ اس طرح میں تاخیر سے پہنچتا اور پرنسپل صاحب کی تنقید کا نشانہ بن جاتا۔

کار والی سے دوستی

ایک روز جبکہ میں کالج پہنچنے کے لئے کسی بڑی گاڑی کا انتظار کر رہا تھا، تو ایک نیلے رنگ کی کار میرے پاس آکر رکی۔ میں سمجھا شاید کوئی ایڈریس وغیرہ پوچھنے کے لئے رکا ہے۔ غور کیا تو اس میں ایک خوبصورت اور جوان لڑکی تھی۔ اس نے میری طرف کھلنے والے دروازے کا شیشہ نیچے کر کے مجھے اشارہ کیا۔ میں ذرا سا آگے بڑھ کر کھڑکی کے سامنے جھکا تو اس نے مجھے بیٹھنے کو کہا۔ میں جھجھک گیا، اور کہا کہ "شکریہ!"۔ اس نے دوبارہ کہا کہ بیٹھ جاؤ۔ مجھے بھی اسی طرف جانا ہے"۔ یہ سنتے ہی میں نے دروازہ کھولا اور بیٹھ گیا۔

گاڑی چلاتے ہوئے اس نے مجھے بتایا کہ "میں یہاں سے روز گزرتی ہوں، اور آپ کو دیکھتی ہوں۔ آپ ٹیوٹا پر نہیں بیٹھتے بلکہ بڑی گاڑی کا انتظار کرتے ہیں۔ میں سمجھ سکتی ہوں کہ اس کی وجہ آپ کا لمبا قد ہے"۔

میں مسکرایا اور "ہاں" میں سر ہلاتے ہوئے کہا کہ "جی بالکل"۔

اس نے پوچھا کہ "کہاں جاتے ہیں؟"

میں نے بتایا کہ "رائے ونڈ روڈ"۔

وہ بولی" صحیح۔ کیا آپ کسی یونیورسٹی وغیرہ میں پڑھتے ہیں یا کسی دفتر وغیرہ میں ملازمت کرتے ہیں؟"

میں بولا "میں ایک سمینری کا طالبِ علم ہوں"۔

اس طرح رفتہ رفتہ اسے معلوم ہوا کہ میں ایک مسیحی ہوں۔ کراچی سے آیا ہوں اور یہاں مسیحی مذہب کی تعلیم حاصل کر رہا ہوں۔ وہ رفتہ رفتہ مجھ سے بے تکلف ہو گئی۔ میں بھی خوش تھا کہ ایک حسینہ سے دوستی بن گئی ہے، اور وقت پر کالج بھی پہنچ جاتا ہوں۔ ایک روز شفقت کو میرے وقت پر کالج پہنچنے کا راز معلوم ہو گیا۔ اس نے وہی کیا، جو اسے کرنا چاہئے تھا۔ یعنی رپورٹ پرنسپل صاحب کے کانوں تک پہنچا دی۔

ایک روز مجھے شدید زکام اتر آیا۔ کالج سے چھٹی کر لی۔ مجھے اسٹاپ پر موجود نہ دیکھ کر طاہرہ نے مجھے فون کر دیا۔ میں نے بتایا تو اس نے مجھے ہاسٹل سے باہر اسٹاپ کی طرف آنے کا کہہ دیا۔ میں نکلا اور اسٹاپ پر پہنچ گیا۔ سب سے پہلے تو اس نے کچھ دیر گاڑی میں ہی بٹھائے رکھا، اور روایتی گفتگو کرتی رہی۔ پھر اس نے مجھے میڈیکل اسٹور پر لے جا کر زکام کی میڈیسن لے کر

دے دی۔ اب وہ مجھے ہاسٹل کے گیٹ تک چھوڑنے کے لئے گاڑی کا رخ موڑنے لگی تو میں نے اسے منع کرتے ہوئے کہا کہ "اب میں خود واپس ہاسٹل چلا جاؤں گا۔ تم بھی یونیورسٹی پہنچو"۔ لیکن اس نے مجھے گیٹ پر لا کر گاڑی کھڑی کی، اور اندر آنے کی ضد کرنے لگی۔ میں نے اسے سمجھایا کہ خواتین کا ہاسٹل میں داخلہ منع ہے۔ لیکن وہ ضد کرنے لگی۔ آخر وہ اندر آ گئی۔ گارڈ نے پوچھا تو میں نے اسے "پھوپھو کی بیٹی" کہہ کر متعارف کروایا۔ یوں ہم دونوں اکیلے ہاسٹل میں میرے کمرے کے اندر تھے۔

ہاسٹل میں کیمرے لگے تھے، اور مجھے یہ بات اچھی طرح معلوم تھی۔ لیکن محبت کے آگے سب ہی بے بس ہو جاتے ہیں۔ میں بھی ہو گیا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے کے "راز و نیاز" کے بعد جب وہ رخصت ہو گئی تو میں بھی میڈیسن اور چائے پی کر سونے کی تیاری کرنے لگا۔ لیکن نیند کہاں آنے والی تھی۔ زکام میں تو نیند آنا ناممکن ہوتا ہے۔ خیر کافی دیر تک کروٹیں بدلتے بدلتے وہ وقت آ گیا، جب ہاسٹل کے باقی لڑکے آن پہنچے۔ یقیناً گارڈ نے شفقت کو بتا دیا تھا، جس پر پرنسپل صاحب تک رپورٹ کا پہنچنا کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ اس کے ایک ہی گھنٹے بعد پرنسپل اور باقی اساتذہ بھی ہاسٹل میں پہنچ گئے، جن میں کینن جیرالڈ مل، پادری شفیق کنول اور پادری شافان شامل تھے۔

روایتی گفتگو کے بعد مجھ سے لڑکی کے بارے سوال کیا گیا کہ "کون تھی؟" میں نے "کزن" کہہ کر جان بچانے کی کوشش کی۔ لیکن اس جواب سے جان تو بچی رہی، مگر کالج چھوٹ گیا۔ مجھ سے ایک کاغذ پر ساری روداد لکھوالی گئی۔ میں نے بھی کھل کر سب کچھ بتا دیا۔ وہ لڑکی ایک مسلم گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ امیر زادی تھی۔ لیکن دین و مذہب سے آزاد تھی۔ اگرچہ وہ یہ چاہتی تھی کہ میں مسلمان ہو جاؤں۔ لیکن یہ صرف وہ شادی میں آسانی کے لئے چاہتی تھی۔

اس کے بعد کالج انتظامیہ نے مجھے چند دن کے بعد کراچی آنے کے لئے رخصت کر دیا۔ میں واپس آ گیا۔ مجھے کالج انتظامیہ کے اس فیصلے پر بہت دکھ ہوا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ دکھ مجھے خود پر ہوا کہ میں نے کیوں یہ سب کچھ ہونے دیا۔ کاش یہ سب کچھ ابھی واقع نہ ہوتا۔ لیکن یہاں کوئی رعایت نہ تھی، نہ کی گئی۔ میں کراچی واپس آ چکا تھا۔

دو نوجوانوں کا قتل

عیسیٰ نگری میں ایک خاتون بنام نسرین گلخار عرف گُڈی منشیات فروشی میں مشہور تھی۔ ایک دن 2012ء میں اس کے گھر میں ڈکیتی کی واردات ہو گئی۔ واردات جس شخص کی طرف سے کی گئی، اس کا نام درویش تھا، اور اس کا منشیات فروشی کا اڈا پرانی سبزی منڈی کی طرف کرنال کالونی میں چلتا تھا۔ یہ ڈکیتی دو جرائم پیشہ گروہوں کے درمیان کا مسئلہ تھا، لیکن اس کو عوامی رنگ دے کر پورے محلے کا مسئلہ بنا دیا گیا۔ ہوا یوں کہ ڈکیتی کے فوراً بعد کرنال کالونی کی طرف سے ایک شخص نے گلی نمبر 7 کے

مدخل پر فائرنگ کر دی، جس سے دو مسیحی نوجوان ناصر اور رفیع شہید ہو گئے۔ اس واقعہ کے بعد عوام نے مشتعل ہو کر گھروں سے نکل کر اجتماعات میں شرکت کرنا شروع کر دی۔ ان اجتماعات کی سربراہی محترمہ نسرین گُڈی اور پیپلز پارٹی منارٹی وِنگ کے چند مسیحی کرتے رہے، جن میں لیاقت منور سرویا، پرویز حبیب، مشتاق مٹو، انور سلطان غوری، اور دیگر لوگ قابلِ ذکر ہیں۔ اس گروہ کی کوششوں سے عیسیٰ نگری کے وہ راستے، جو کرنال بستی کی طرف آنے جانے کے لئے استعمال ہوتے تھے، بند کر دیئے گئے۔

سنگِ شہادت کا مسئلہ

ناصر اور رفیع کی شہادت کے بعد بعض لوگوں نے فیصلہ کیا کہ گلی میں شہداء کی یادگاری کے لئے سنگِ شہادت نصب کیا جائے۔ اس کے لئے میرے چرچ کا کمپاؤنڈ منتخب کیا گیا۔ میں نے اس تجویز سے اتفاق نہ کیا۔ میرے خیال کے مطابق جہاں گلی بند کی گئی تھی، وہاں اس یادگار کی جگہ مناسب و موزوں تھی۔ اس پر بعض لوگوں نے مجھے برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔

اس واقعہ کے کچھ دن بعد ہی بھائیوں نے گھر میں ایک اجلاس رکھ لیا، جس میں پیپلز پارٹی منارٹی وِنگ کے دو ذمے دار جناب پرویز حبیب عرف پیجو سکھ اور ان کے ساتھ ایک اور شخص بھی شامل ہوا۔ فیصلہ تقسیمِ جائداد کے حوالے سے تھا۔ سب نے متفقہ فیصلہ دیا کہ "بشیر جَون کی وراثت میں صرف چرچ کا ٹکڑا ہو گا۔ وہ اس کو خواہ گھر بنائے خواہ چرچ ہی رہنے دے، یا بھلے فروخت کر دے"۔ مجھے نہیں معلوم کہ آخر یہ فیصلہ کیونکر ہوا، اور کون اس فیصلے کا ماسٹر مائنڈ تھا۔ البتہ اس وقت کو ٹالنے کے لئے مجھے اس پر خاموشی اختیار کرنا پڑی۔ تاہم یہ سوال بار بار میرے ذہن میں اٹھتا کہ آخر اس فیصلے کی حیثیت کیا ہے؟ نہ یہ کورٹ میں ہوا، نہ ہی باقاعدہ کوئی پنچایت بیٹھی، اور نہ ہی حکومتی یا ریاستی سرپرستی میں اس کا کوئی ریکارڈ داخل کروایا گیا۔ اسی فیصلے کی بنیاد پر آخر کار مجھے میرے وراثتی حق سے محروم کر دیا گیا۔ یعنی 2019ء میں پھر ایک اجلاس بلا کر پرویز حبیب اور لیاقت منور سرویا کی موجودگی میں مجھے آخری انتباہ کے ساتھ مقدمے میں پھنسا دینے کی دھمکی بھی دے گئی، اور مجھے لاہور ہجرت پر مجبور کر دیا گیا۔ اس وقت میں نے پرویز حبیب اور لیاقت منور صاحب سے کہا کہ "سابقہ فیصلے کی کوئی حیثیت نہیں"۔ تو کہنے لگے کہ "ہمیں کیا سمجھتے ہو؟" میں نے عرض کی؛ "آپ کوئی جج، قاضی یا ریاست کے ذمہ دار نہیں"۔ تو کہنے لگے کہ "ہم ذمہ دار ہیں"۔ میں نے پوچھا؛ "کس نے آپ کو اس طرح کے فیصلے کرنے کی ذمہ داری دی؟" کہنے لگے کہ "مسیحی قوم اور پیپلز پارٹی نے"۔ میں نے پوچھا کہ؛ "قوم اور پیپلز پارٹی نے مجھ سے رائے نہیں لی"۔ تو کہنے لگے کہ "پارٹی کو عام لوگوں کی رائے لینے

کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ پارٹی فیصلے کرتی، اور مسلط کرتی ہے۔ جیسے کہ کسی بھی غیر معروف شخص کو ٹکٹ دے کر ایوانوں میں بٹھانا" وغیرہ۔

چرچ کی رجسٹریشن

2014ء میں میں نے اپنے چرچ کی رجسٹریشن کے لئے کوشش شروع کی، اور کسی مسیحی سیاسی نمائندے کی طرف سے این او سی (NOC) کی ضرورت کے پیشِ نظر پیپلز پارٹی اور ایم کیو ایم کے منارٹی وِنگز تک رسائی حاصل کی۔ لیکن کسی کی طرف سے این او سی جاری نہ ہوا۔ اس پر میں نے اپنے وکیل کے ذریعے سب رجسٹرار کراچی سے درخواست کی کہ وہ میری فائل پر جمع نہ کرنے کی وجہ لکھ کر مہر لگا دیں۔ تاکہ میں کورٹ سے رابطہ کرلوں۔ کیونکہ کوئی مسیحی نمائندہ مجھے این او سی دینے کے لئے تیار ہی نہیں۔ اس پر سب رجسٹرار نے میری فائل جمع کرلی۔ فائل تو جمع ہوگئی، لیکن مجھے اس کا بے صبری سے انتظار کرنا پڑا۔ تاہم میں اس انتظار میں اپنی تحریری و تقریری سرگرمیوں کو جاری رکھے ہوئے تھا۔ کہ اس دوران کراچی کے دو مسیحی صحافیوں نے میرے متعلق ایک جھوٹی خبر اخبار (روزنامہ آفتاب کوئٹہ) میں شائع کر دی۔ اس خبر کی اشاعت کے دوران میں سیالکوٹ میں تھا، جہاں مجھے ایک بشارتی اجتماع میں کلام سنانا تھا۔

ٹھیک آٹھ ماہ بعد مجھے فائل ملی، اور میں خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ لیکن جلد ہی میری خوشی اداسی میں بدل گئی۔ کیونکہ جس روز مجھے فائل ملی، ٹھیک تیسری رات 3 بجے کے قریب پندرہ بیس پولیس اہلکار چرچ کی دیواریں پھلانگ کر گھر میں گھس آئے، اور گھر کا نقشہ بدل دیا۔ میری کتابیں بکھیر دیں۔ شاید وہ رجسٹریشن فائل کی تلاش کر رہے تھے۔ جب کوئی قابلِ گرفت شئے نہ ملی تو میرے بڑے بھائی مشتاق نانک کو گرفتار کر کے لے گئے، اور تھانے لے جاتے ہی جھوٹی ایف آئی آر کاٹ دی۔

صبح ہونے تک مجھے نیند نہیں آئی، اور میں اس حادثے کی وجوہات جاننے کے لئے فکر و استغراق کی حالت میں رہا۔ جب صبح ہنوز میں تھانے جانے کے لئے تیار ہو رہا تھا تو بڑی بھابھی آگئیں۔ بھابھی نے آتے ہی مجھ سے سوال کیا کہ "بشیر! یہ تم نے کیا کیا؟" میں نے حیرت سے پوچھا کہ "میں نے کیا کیا ہے؟" تو بھابھی نے جواب دیا کہ "باہر لوگ یہ باتیں کر رہے ہیں کہ بشیر نے اپنے بھائی مشتاق پر جھوٹی ایف آئی آر کٹوا دی ہے"۔ یہ سن کر مجھے شدید ذہنی دھچکا لگا، اور میرا دھیان مسیحی صحافیوں، اور علاقے کے چند سیاسی کارکنوں کی طرف چلا گیا۔ میرے شبہے کو مزید تقویت اس بات سے بھی ملی کہ جب دوسرے دن میں

بھائی کی رہائی کے لئے سٹی کورٹ کراچی پہنچا تو محلے کے دو سیاسی کارکن لیاقت منور سرویا، اور پرویز حبیب عرف پیجو سکھ وہاں ہمارے مقدمے کی مخبری کر رہے تھے۔

سوشل میڈیا پر میں نے اس ناانصافی اور ظلم کے خلاف بہت احتجاج کیا۔ لیکن نہ ہی قوم نے سنا، اور نہ ہی کسی ریاستی ادارے کی طرف سے مدد فراہم ہوئی۔ بلکہ الٹا میرے بھائیوں نے مجھے اپنا دشمن خیال کرتے ہوئے وراثت کا حق مار لیا، اور مجھے مسلسل گھر چھوڑنے پر مجبور کرنے لگے۔ میں نے بہت سمجھایا کہ نہ تو میں مسلمان ہوا ہوں، اور نہ ہی میں نے مشتاق بھائی پر مقدمہ بنوایا ہے۔ لیکن میری ایک بھی نہ سنی گئی۔ ڈیڑھ سال تک شدید ذہنی کشمکش کے بعد میں نے گھر بار چھوڑ دینے کا ارادہ کر لیا۔ کیونکہ انصاف کہیں بھی موجود نہیں تھا، جس کا سہارا لے کر میں خود کو بے قصور ثابت کرتا۔

ہر ہر قدم پر مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی خاص گروہ ہے، جو مجھے مسلسل برادری سے خارج کر دینے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا ہے۔ کوئی تو ہے، جو مجھے مسیحیت سے خارج کرنے کی کوشش و تدبیر کر رہا ہے۔ اس گروہ میں کون افراد شامل ہیں؟ کس کس کو مجھ سے کیا کیا دشمنی ہے؟ میں ان باتوں سے ہنوز ناواقف تھا۔ بہر حال کوئی تھا ضرور۔ لیکن مجھے حیرت و افسوس صرف اس بات پر ہو رہا تھا کہ آخر جو کوئی بھی ہے، اس نے مذہبی مسئلہ بنا کر ہی کیوں مجھ سے دشمنی یا انتقام لینے کا تہیہ کر رکھا ہے۔ کوئی اور الزام بھی تو لگایا جا سکتا تھا۔ مثلاً محض لڑکی بھگانا، یا قتل، یا اغوا، یا چوری اور ڈاکا، یا اسی نوعیت کا کوئی بھی اَور الزام۔

اس کا لازمی نتیجہ تو یہی نکلتا ہے کہ میرے مذہبی طور پر شناخت یا پہچان بنانے اور کام کرنے ہی سے کسی کو نقصان پہنچ سکتا تھا، اور اسی نسبت سے مجھے بدنام کر کے کسی کو فائدہ پہنچ سکتا تھا۔ لہٰذا آج جب میں اس امر پر غور کرتا ہوں، تو بات سمجھ میں آنا شروع ہو گئی ہے۔ میرے دشمن پیپلز پارٹی منارٹی وِنگ اور ایم کیو ایم اقلیتی امور کمیٹی کے وہ مسیحی تھے، جو بیک وقت سیاست اور مذہب کو یرغمال بنائے ہوئے تھے۔ جہاں اتنے سارے لوگ شہرت خریدنے کی کوشش کے باوجود ناکام و نامراد ہو رہے تھے۔ خدا نے وہاں مجھے بے مول کی شہرت سے نواز رکھا تھا۔ شاید اسی وجہ سے بعض لوگوں کے دل میں حسد پیدا ہو گئی تھی، اور انہیں یہ وہم کھائے جا رہا تھا کہ کہیں میں مضبوط ہو کر سیاست میں نہ آ جاؤں۔

چرچ بلڈنگ کی فروخت کا مفروضہ

جن دنوں میں اپنے بھائی کی رہائی کے لئے بھاگ دوڑ کر رہا تھا، انہی دنوں کراچی میں مقیم ایم کیو ایم کے بشپ جناب جیمس جان پال صاحب میرے ساتھ مسلسل ٹیلیفونک رابطہ میں تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ میرا چرچ ان کو کرائے پر مل

جائے۔ وجہ یہ تھی کہ علاقے میں جو حالات پیدا ہو گئے تھے، انہوں نے مجھے مذہبی کم اور سیاسی زیادہ بنا دیا تھا۔ نیز میرے وسائل بھی اتنے نہیں رہے تھے کہ میں چرچ میں کوئی مذہبی و علمی مصروفیت شروع کر سکوں۔ لہٰذا بشپ صاحب کے مسلسل اصرار پر میں چرچ بلڈنگ ان کو کرائے پر دینے کے لئے آمادہ ہو گیا۔ جونہی بلڈنگ ان کو کرائے پر دی، محلے میں یہ افواہ گردش کرنے لگی کہ میں نے چرچ بلڈنگ بیچ دی ہے۔ دو تین ماہ تک یہ افواہ میرے لئے ایک بہت بڑا مسئلہ بن چکا تھا۔ بھائیوں نے گھر میں مجلس بلالی اور مجھے کہا کہ تم نے چرچ بیچ دیا ہے، اور ہم سے مشورہ تک نہیں کیا۔ میں نے کہا کہ بیچا نہیں، کرائے پر دیا ہے۔ کرایہ نامہ دکھانے کا مطالبہ کیا گیا۔ لیکن کرایہ نامہ تو نہیں تھا۔ کیونکہ بشپ صاحب 1992ء سے میرے واقف تھے۔ میں ان پر اس معاملے میں اعتماد کرتا تھا، اس لئے کسی طرح کی کاغذی کاروائی کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔

بھائیوں نے بتایا کہ ہم نے سنا ہے کہ تم نے اٹھارا لاکھ روپے میں چرچ بلڈنگ بیچ دی ہے۔ میں سٹپٹا کر رہ گیا۔ بشپ صاحب سے بات کی تو انہوں نے کہا کہ تین ماہ میں ہم علاقے میں کلیسیا بنانے میں بہت حد تک کامیاب ہو گئے ہیں۔ اگر کسی طرح کی رکاوٹ آتی ہے تو خداوند کا کام متاثر ہو جائے گا۔ میں نے عرض کی کہ پھر کیا حل نکالا جائے۔ کیونکہ اس افواہ کی بنیاد پر میرے بھائی مجھے جائداد سے بے دخل کرنا چاہ رہے ہیں۔ بشپ صاحب نے مجھے کہا ہم ایک اشٹام پیپر بنا لیتے ہیں، جس میں یہ مواد ہو گا کہ آپ نے یہ چرچ ہمیں عطیہ (Donation) کیا ہے۔ اس سے کسی کو شک وشبہ نہیں رہے گا، اور آپ پر کوئی الزام بھی نہیں آئے گا۔ بظاہر یہ مشورہ تو برا نہیں تھا۔ لیکن اس کا مطلب صاف یہ تھا کہ آئندہ میں اس چرچ بلڈنگ کو کبھی استعمال یا حاصل نہیں کر سکوں گا۔ کیونکہ عطیہ کی ہوئی شئے واپس طلب نہیں کی جاتی۔ مجھے دل ہی دل میں بشپ صاحب کے مشورے پر دکھ ہوا۔ لیکن مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ میں نے ان سے کہا کہ بشپ صاحب اس طرح تو مجھے کچھ بھی فائدہ نہیں ہو گا۔ بلکہ جو ماہانہ کرایہ آپ کی طرف سے مل رہا ہے، یہ بھی غیر واجب ہو جائے گا۔ اس پر بشپ صاحب نے دوسری بات بتائی کہ ہم دو اشٹام پیپر بنائیں گے۔ ایک عطیہ کا اور دوسرا فروخت کا۔ فروخت کے اشٹام کے مطابق آپ کو کچھ رقم بھی مل جائے گی، تا کہ آپ بوقتِ ضرورت اپنی زندگی کے معاملات کو سلجھا سکیں۔ میں نے عرض کی کہ جناب چرچ بھی گیا، اور گھر بھی۔ میرے لئے مستقبل ختم ہو جائے گا۔ اس پر انہوں نے مجھے تسلی دی کہ آپ کو ہم نیو ریوائیول چرچ کی سمینری میں بطورِ اسٹاف رکھیں گے، اور اگر ممکن ہوا تو اسی چرچ بلڈنگ کو تین منزلہ بنا کر آپ کی رہایش کا مسئلہ بھی یہیں حل کر دیں گے۔ یہ خواب مجھے بہت بھلے معلوم ہوئے۔ ویسے بھی سبز باغ بھلے ہی معلوم ہوتے ہیں۔ اس پر میں نے فیصل آباد سے تعلق رکھنے والے ایک مسیحی سماجی کارکن جناب اسد نعیم سے مشورہ کیا۔ انہوں نے مجھے خبردار کیا کہ بشپ کے جھانسے میں نہ آنا، وہ آپ کو دھوکا دے رہا ہے۔ لیکن میں ڈر رہا تھا کہ لوگوں میں مسیحیت مخالف کے طور پر بدنام کر دیا جائے گا۔ کیونکہ انہی ایام میں چند ہفتے پیشتر میں نے احمد ایم لعل نامی ایم کیو ایم کے ایک پادری کے پروگرام کو روکنے کی کوشش کی تھی، جو مستقل ہر بدھ کے روز میرے چرچ کے سامنے گلی بند کر دیا کرتا تھا۔ لہٰذا میں نے سوچا اگر بشپ جیمس کو بھی منع کر دیا، تو لوگ مجھے مذہب کا مخالف ہی سمجھ لیں گے۔

لہٰذا بشپ جیمس صاحب کی دوسری تجویز میں مجھے کچھ نفع محسوس ہو رہا تھا، اس لئے میں نے مجبوراً اس تجویز کو مان لیا۔ چرچ بلڈنگ کی مالیت تو یقیناً چھ لاکھ نہیں تھی۔ کیونکہ شہر کے بیچوں بیچ مسیحیوں کی سب سے بڑی آبادی میں یہ چرچ بلڈنگ واقع تھی۔ لیکن میں ہر طرح سے پھنس چکا تھا۔ خیر چھ لاکھ روپے طے ہوئے، جن میں سے بشپ صاحب نے دو تین افراد کی موجودگی میں مجھے پچاس ہزار روپے بیعانہ کے طور پر تھما دیئے۔ اس رقم کو گنتے وقت انہوں نے میری تصویریں بھی اتاریں، اور بعد ازاں ایک اشٹام پیپر بنوا کر مجھ سے دستخط بھی کروالئے۔ میں صرف پرانی واقفیت اور بھروسے کی بنیاد پر یہ سب کچھ ہونے دے رہا تھا۔

بشپ صاحب کی طرف سے ملنے والی رقم سے میں نے سیدھا اردو بازار کراچی کا رخ کیا، اور وہاں ایک دکان کرائے پر حاصل کر لی۔ یہاں میں نے "یونیورسل بک کارنر" کے نام سے کتب فروشی کا کام شروع کر دیا۔ اس دوران باقی معاملات و مسائل کو بھی سلجھانے کی کوشش کرتا رہا، لیکن دن بدن مسائل پہاڑ کی شکل اختیار کرتے جا رہے تھے۔ ایک دن بڑے بھائی نے میرا پیچھا کیا، اور اردو بازار والی دکان پر پہنچ گیا۔ معلوم نہیں کہ اس کی کیا سوچ تھی۔ البتہ مجھے اس کی باتوں سے محسوس ہوا کہ وہ دکان اپنے ہاتھ میں کرنا چاہتا ہے۔

بشپ جیمس کی طرف سے ایک دو اقساط میں تقریباً دو لاکھ روپے مل گئے، جن میں سے میں نے بڑے بھائی امیر کے پچاس ہزار روپے واپس دے دیئے، جو کچھ سال پیشتر بیرونِ ملک جانے کی غرض سے میں نے لئے تھے۔ البتہ بشپ صاحب کی طرف اب چار لاکھ روپے باقی تھے۔ ایک دن انہوں نے مجھے فون کیا، اور گھر بلا کر چار لاکھ روپے کا چیک تھما دیا، اور تمام رقم کی وصولی کی تصدیق کے لئے دستخط لے لئے۔ میں چیک لے کر گھر آ گیا۔ دوسرے دن چیک کیش کرانے کی غرض سے بینک پہنچا، لیکن مایوس ہو گیا۔ کیونکہ چیک کیش نہ ہو سکا۔ میں نے بشپ صاحب کو صورتحال سے آگاہ کیا، تو انہوں نے بتایا کہ ابھی اکاؤنٹ میں پیسے نہیں آئے۔ کچھ دن تک آ جائیں گے تو آپ چیک کیش کروالینا۔ میں انتظار کرنے لگا۔ یہ چیک آج بھی میرے پاس موجود و محفوظ ہے۔ لیکن اس کی تاریخ نکل چکی ہے۔ جب بھی بشپ صاحب کو فون کیا، ان سے بات نہ ہو پائی۔ وہ میری کال ہی نہیں اٹھاتے۔ اس دوران بھائیوں اور محلہ میں پیپلز پارٹی کے چند سیاسی و سماجی کارکنوں کی طرف سے مجھے مسلسل علاقہ چھوڑنے کے لئے مجبور کیا جانے لگا۔ آخر کار میں نے بیوی بچوں کو لیا، اور لاہور کی طرف ہجرت کا ارادہ کر لیا۔

میرے مسلمان ہونے کی حقیقت

ڈیڑھ سال تک میں نے ہر ممکن کوشش کی کہ حالات کو اپنے حق میں موڑ لوں۔ لیکن میں مسلسل ناکام ہوا۔ کسی طرف سے کوئی امید کی کرن نظر نہیں آرہی تھی۔ آخر میں نے سوشل میڈیا پر ان مسلمانوں سے اپنے رویے پر نظر ثانی شروع کر دی، جن کے ساتھ میں تحریری مناظرے کر رہا تھا۔ کیونکہ اب میرے دل میں یہ خیال آرہا تھا کہ اپنے بھائی اور اپنی برادری تو مجھے فراموش کر رہی ہے۔ محض ایک جھوٹی خبر اور ایک جھوٹے مقدمے کی غلط فہمی نے مجھ سے سب کچھ چھین لیا ہے۔ کیوں نہ مسلمانوں میں اپنی جگہ تلاش کروں۔ لہٰذا میں نے سب سے پہلے تو اپنے اس مواد کو سوشل میڈیا سے اڑانا شروع کیا، جو ردِ اسلام سے علاقہ رکھتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ میں نے اسلام اور مسلمانوں کی اچھی باتوں کی تعریف پر کلمات لکھنا شروع کر دیئے۔ میرے ایک کمنٹ پر کوئٹہ کے ایک مسیانک دوست نے مجھے کہا کہ "اگر آپ کو اسلام اور مسلمان اتنے ہی اچھے لگتے ہیں تو مسلمان ہو جاؤ"۔ میں نے اسے کہا کہ مسلمان ہونا کون سی بری بات ہے"۔ اس پر اس نے کہا کہ "بسم اللہ کرو اور کلمہ پڑھو"۔ میں نے کمنٹ میں "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" لکھ دیا۔ بس پھر کیا تھا، میرے کمنٹ کے اسکرین شاٹس مسیحی اور مسلم دونوں گروپوں میں آویزاں کئے جانے لگے۔ اس طرح مذہبی طور پر میرے مسائل سلجھنے کی بجائے مزید الجھتے چلے گئے۔

اس دوران سب سے بڑا شکوہ، جو مجھے خدا سے رہا، یہ تھا کہ یہ سب میرے ہی ساتھ کیوں؟ میں تو بچپن سے مسیحیت کا داعی رہا ہوں اور میں نے اپنی تمام فکری و فنی صلاحیتیں مسیحیت اور مسیحیوں کے لئے استعمال کی ہیں۔ پھر میری آواز پر کوئی کیوں کان نہیں دھر رہا، اور میرے جذبات و اخلاص کی قدر و قیمت کیوں نہیں کی جارہی؟ کیوں مجھے بغیر کسی گناہ کے اتنا پریشان کیا جارہا ہے؟ جہاں اتنے سارے نام نہاد اور بے شعور مبشر اور پادری بغیر کسی طرح کی مزاحمت کے شوقیہ تبلیغ و تبشیر میں مصروف ہیں اور چندے کے دھندے سے اچھی اور آرام دہ زندگی کا مزہ لوٹ رہے ہیں، وہاں مجھے کیوں اس شعبے کے لئے قبول نہیں کیا جارہا؟

بسیار سوچ بچار کے بعد آخر کار میرا دل مذہب اور قومیت کے جذبات سے خالی ہونا شروع ہوا، اور میں نے ارادہ کیا کہ اپنے بچوں کی ضروریات کے لئے زندگی گزاری جائے اور کوئی ایسا راستہ اپنایا جائے، جس میں کم از کم میرے بچوں کے بہتر مستقبل کی کوئی امید مل سکے۔ لیکن مجھے اس وقت معلوم ہوا کہ میں تو کسی بھی شعبے کے لئے موزوں ہی نہیں ہوں، سوائے مذہب کے۔ کیونکہ میں نے بچپن ہی سے کوئی ٹیکنیکل کورس نہیں کیا تھا۔ کوئی ایسی ڈگری حاصل کرنے کے لئے تعلیم حاصل نہ کی تھی کہ جس کی بنیاد پر مجھے ریاستی اداروں میں کوئی ملازمت مل جاتی۔ نہ ہی پرائیویٹ اداروں میں کام کرنے کا کوئی تجربہ تھا۔ بس مذہب تھا، شعر و ادب تھا، اور فلسفہ تھا۔

اس صورتحال میں صرف ایک ہی راستہ باقی بچا تھا۔ یعنی کسی دوسرے مذہب کی پناہ۔ چونکہ میں فلسفہ و مذہب کا طالب علم رہا ہوں، اس لئے مجھے اپنی تسکینِ روح کے لئے کسی مذہب ہی کی طرف رخ کرنا چاہئے تھا۔ مسیحیت میں میرے لئے تمام راستے بند کر دیئے گئے تھے۔ لہٰذا میں نے اسلام کے بارے سوچنا شروع کر دیا۔

2015ء میں میرے چرچ کی رجسٹریشن فائل آ چکی تھی۔ لیکن حالات اس کے مانع تھے کہ میں چرچ کے لئے کام کروں۔ لہٰذا میں نے اسلام قبول کرنے کا ارادہ کر لیا۔ نومبر 2015 کے ابتدائی ایام تھے کہ میں نے مسلم فرقوں کے حوالے سے ایک جامع معلوماتی کتاب کی تلاش شروع کر دی۔ میرے ایک شاگرد مبشر فیصل فضل کے ذریعے مجھے ایک کتاب بنام "مسلم فرقوں کا انسائیکلوپیڈیا" مل گئی۔ اس کتاب کے مؤلف کوئی مسیحی بنام نعیم اختر سندھو صاحب تھے۔ میں نے چند دنوں میں یہ کتاب پڑھ ڈالی، اور فرقوں کا آپس میں تقابل کر کے ایک فرقہ "اہلحدیث" کو منتخب کر لیا۔ اس فرقے کو منتخب کرنے کی وجوہات کا تذکرہ کسی اور جگہ کروں گا۔ یہاں فی الحال یہی بتانا کافی ہو گا کہ اس فرقے کو منتخب کرنے کے بعد اب ان سے رابطے کا مرحلہ باقی تھا۔ سوشل میڈیا پر اس دوران میرے ساتھ مختلف مسلم فرقوں کے افراد شریک تھے۔ ان میں ایک شخص اسلام آباد سے تعلق رکھنے والے جناب اویس اختر صاحب تھے۔ ان سے مختصر برقی خط و کتابت کے بعد میں نے کراچی میں واقع اہلحدیث کے مرکز "جامعہ دراسات الاسلامیہ" کا رخ کیا۔ وہاں پہنچا تو مفتی جناب محمد یوسف کشمیری صاحب سے شرفِ ملاقات حاصل ہوا۔ علیک سلیک کے بعد مدعا پیش کیا تو موصوف نے بڑی سنجیدگی سے میری بات چیت سنی۔ لیکن انہوں نے مجھے اس دن کلمہ نہیں پڑھایا۔ میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگے کہ آپ کل تشریف لے آئیں، پھر انشاءاللہ۔ وہاں سے رخصت ہونے کے دوران مجھے خیال آیا کہ یقیناً وہ اس معاملے میں جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہ رہے ہوں گے۔ میں اگلے دن کا انتظار کرنے لگا۔ اگلے دن وقتِ مقررہ پر پہنچا تو موصوف درس و تدریس میں مصروف تھے، اور مجھے ان کے دفتر میں ان کا انتظار کرنے کی کوفت اٹھانا پڑی۔ بہر حال میں نے ارادہ کر لیا تھا، اس لئے سکون سے بیٹھا رہا۔ کچھ دیر کے بعد وہ دفتر میں داخل ہوئے، مجھے دیکھا اور خوشی و حیرت کے ملے جلے تاثرات میں بے تکلف ہو گئے۔ پانی منگوایا گیا، چائے منگوائی گئی اور چند رسمی موضوعات پر گفتگو کے بعد اصل مدعے پر بات چل پڑی۔ لیکن موصوف نے مجھے پھر اگلے دن کا وقت دے دیا۔ میں حیران و پریشان تھا کہ آخر وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ میں نے تو سن رکھا تھا کہ مسلمان زبردستی غیر مسلموں کو کلمہ پڑھوا لیتے ہیں، لیکن یہاں تجربہ اس مفروضے کی تائید نہیں کر رہا تھا۔ خیر چار و ناچار میں رخصت ہوا، اور گھر پہنچ کر معمولات میں مشغول ہو گیا۔ اگلے دن پھر پہنچ گیا، لیکن راستے میں سوچتا گیا کہ اگر آج بھی کلمہ نہ پڑھ سکا تو پھر فرقوں کے انتخاب میں اپنے فیصلے پر ضرور نظر ثانی کروں گا۔ لیکن آج وہاں پہنچنے پر معلوم ہوا کہ مفتی صاحب کے علاوہ دو اَور اشخاص بھی تشریف فرما تھے، جن میں سے ایک صحافی تھے۔ تیسرے چکر میں مفتی صاحب نے یہ کہتے ہوئے کہ "آپ واقعی پکے ارادے سے مسلمان ہونا چاہتے ہو"، مجھے کلمہ پڑھوا دیا، اور تصویر بنا

لی۔ انہوں نے اس کے بعد مجھے ایک عدد سند، جسے "قبولِ اسلام کی سند" کہا جاتا ہے، بنا کر دے دی۔ یہ سند بالکل اسی طرح ہے، جس طرح مسیحیت میں شامل ہونے کے دوران بپتسمہ کا سرٹیفکیٹ ہوتا ہے۔

میں اس سند کو حاصل کرنے کے بعد سوچنے لگا کہ اب کسی مسلم ادارے میں ملازمت کی کوشش کرنا چاہئے۔ لہٰذا سب سے پہلے میں نے اپنے سوشل میڈیا کے ایک دوست فرمان شیخ سے رابطہ کیا، اور ان کو یہ خوشخبری سنائی کہ میں نے قبولِ اسلام کی سند حاصل کر لی ہے۔ پھر تو جیسے سوشل میڈیا پر مجھے از خود کوئی اعلان کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ کیونکہ جلد ہی تمام مسلمان دوست مجھ سے محبت و شفقت کے جذبات کا اظہار کرنے لگے۔

فرمان شیخ کے ذریعے مجھے ایک سابق پادری جناب شیخ عبد اللہ صاحب سے شرفِ ملاقات حاصل ہوا۔ یہ موصوف زمانہِ مسیحیت میں سیونتھ ڈے ایڈونٹسٹ چرچ سے منسلک تھے، اور ان کا پرانا نام عمانوایل جان تھا۔ ایک دن ان کا فون آیا، اور انہوں نے بتایا کہ وہ کراچی میں صرف مجھے ہی ملنے کے لئے آئے ہوئے ہیں۔ میں نے فوراً ملاقات کی حامی بھر لی، اور غالباً لیاقت آباد 10 نمبر (لالو کھیت) کی چورنگی پر ان سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ وہ مجھے حبیب بینک چورنگی پر لے گئے، جہاں انہوں نے میری ملاقات مفتی محمد عاصم صدیقی اور ڈاکٹر عمیر محمود صدیقی صاحب سے کروائی۔ مسیحیت اور اسلام کے تقابل کے حوالے سے بہت سے موضوعات زیرِ بحث آئے۔ مفتی عاصم صاحب کے الفاظ یہ تھے کہ "پاکستان میں آج تک جتنے مسیحیوں کو مسلمان ہوتے ہوئے دیکھا ہے، آپ ان سب سے مختلف ہیں"۔ اس ملاقات کے بعد مفتی عاصم صاحب نے ذاتی طور پر کوئی چھ ماہ تک متواتر میری مالی معاونت فرمائی، اور ساتھ ہی مجھے اسلامک سینٹر (نارتھ ناظم آباد) میں چار ماہ کے لئے "ردِ عیسائیت" کورس پڑھانے کے لئے بھیج دیا، جہاں میں نے یہ ذمہ داری نبھائی۔

ڈیڑھ دو سال ہی مشکل سے گزرے تھے کہ بھائیوں نے آخری انتباہ کے ساتھ مقدمے کی دھمکی دے دی، اور تین ماہ کے اندر گھر چھوڑنے کا کہہ دیا، اور مختلف طریقوں سے مجھے اذیت پہنچانے لگے۔ بلآخر 30 دسمبر 2018ء کو میں نے کراچی سے بھاگنے کا منصوبہ بنا لیا۔ ملتان میں میرا ایک مسلم دوست تھا، جس کے ساتھ سوشل میڈیا پر جان پہچان بنی تھی۔ میں نے اسے فون کیا، اور اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔ اس نے فوراً کہا کہ آجاؤ۔

میرا قبولِ اسلام بجبوری تھا۔ کیونکہ جب محض غلط فہمی کی بنا پر ہر طرف میرے لئے دروازے بند کر دیئے گئے تھے، تو مجھے تنہائی کی زندگی گزارنے کی بجائے ایک معاشرے اور برادری کی ضرورت تھی۔ جس کی وجہ سے مجھے کسی نہ کسی طرف کسی انسانی گروہ میں شامل ہونا ہی تھا۔ اب میری اس بنیادی انسانی ضرورت کے تحت کئے گئے اقدام پر مجھے تو عتاب و عذاب کا نشانہ بنایا گیا۔ لیکن جن افراد نے میرے متعلق یہ غلط فہمی پھیلائی، ان کے خلاف کوئی انتباہی اقدام تک بھی نہیں کیا گیا۔ حالانکہ میں ڈیڑھ دو سال تک یہ رونا روتا رہا کہ میرے متعلق یہ خبر غلط ہے۔ اس سب کے باوجود جب مجھے مسلمانوں میں پناہ کی

ضرورت محسوس ہوئی تو انہوں نے کچھ جانتے اور بھانپتے ہوئے بھی مجھے فراخدلی سے مدد فراہم کی۔ مجھے مسلمانوں سے کسی قسم کا نہ کبھی کوئی شکوہ تھا، اور نہ آئندہ کبھی ہو گا۔

ملتان کی طرف کوچ

میرا خیال تھا کہ شیخوپورہ اپنے تایازاد بھائیوں کے پاس چلا جاؤں۔ لیکن معلوم ہوا کہ میرے بھائیوں نے ان کو یہاں کراچی میں ہونے والے واقعات سے آگاہ کر کے میری طرف سے تاکید کر دی ہے کہ مجھ سے قطعِ تعلق کر لیں۔ لہٰذا میں مایوس ہو کر رہ گیا۔ کراچی چھوڑ دینے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ بیوی بچوں کی فکر بھی جان کو کھائے جا رہی تھی۔ لہٰذا مجھے جلد کوئی راستہ نکالنا تھا۔ تاکہ بچوں کو بھائیوں کے رحم و کرم پر نہ چھوڑنا پڑے۔

میں نے اپنے دوست ابو ہشام کو فون کیا، اور سارا معاملہ بتا کر ملتان کی طرف رختِ سفر باندھ لیا۔ ملتان پہنچ کر معلوم ہوا کہ دوست گھر پر نہیں۔ تین دن ملتان ریلوے اسٹیشن کے قریب ایک سستے سے ہوٹل میں ٹھہرنا پڑا۔ یہ تین دن بہت اذیت ناک تھے۔ کیونکہ ہوٹل کے کمرے میں گندا بستر اور پھر اس میں کٹھمل، جان کو ہلکان کرتے رہے۔ لیکن میری مجبوری یہ تھی کہ 300 روپے یومیہ پر اس سے بہتر کمرہ ملنا ناممکن تھا۔ لہٰذا صبر و شکر کے ساتھ یہ تین دن تین سال سے کم معلوم نہ ہوتے تھے۔

تین دن کے مسلسل اذیت ناک انتظار کے بعد آخر کار دوست نے رابطہ کیا اور مجھے اپنے گھر لے گیا۔ زندگی میں پہلی بار کسی مسلمان کی مہمان نوازی سے واسطہ پڑا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ نہ صرف ایک سچا مسلمان ہے، بلکہ ایک اچھا انسان بھی ہے۔ اس نے 13 دن مسلسل میرے آرام کے لئے ہر ممکن کوشش کی، اور بالآخر لاہور میں میرے قیام کی راہ نکال لی۔

لاہور کی طرف ہجرت

یوں تو لاہور میرے لئے کوئی اجنبی شہر نہ تھا۔ لیکن اب مجھے یہاں بھی اجنبیت کا احساس ہونے لگا تھا۔ فیروز پور روڈ پر واقع کوٹ لکھپت اور اس کے اندر ماڈرن کالونی اور بہار کالونی میرے لئے مانوس علاقے تھے۔ 1996ء میں میں نے ڈھائی سال

بہار کالونی کی ایک سیمنری میں گزارے تھے۔ اسی دوران ایف جی اے بائبل اسکول میں جناب پادری حزقی ایل سروش اور نذیر قیصر صاحب کے ساتھ دو تین مشاعرے پڑھے تھے۔ یوحنا آباد کی طرف بھی جانے کا موقع ملتا رہا۔

اردو بازار اور انار کلی میں تو سارا سارا دن گزار کر آجایا کرتا تھا۔ لیکن آج معلوم نہیں کہ میں کیوں ان راستوں سے منہ چھپانے، اور نظر بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہشام بھائی مجھے ٹھیک فیروز پور روڈ پر بہار کالونی کے قریب لے آئے۔ یہاں ایک ادارے "حقوق الناس" کا دفتر تھا، جو نَو مسلمین کی فلاح و بہبود کے لئے کام کر رہا تھا۔ مجھے یہاں متعارف کروانے میں ہشام بھائی کو کوئی دقت محسوس نہ ہوئی تھی۔ کیونکہ یہاں کے چند افراد مجھے غائبانہ طور پر سوشل میڈیا کے ذریعے پہلے ہی سے جانتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے جلد ہی یہاں ایڈجسٹ کر لیا گیا۔ اس ادارے نے میرے لئے جو کچھ اس دوران کیا، اس کے لئے میرا دل دعاؤں سے لبریز ہے۔ ادارے کے جنرل سیکریٹری جناب عبدلاوارث گل صاحب نے چند دن کے بعد مجھے کچھ روپے دیئے اور بیوی بچوں کو بھی لے آنے کی ہدایت دے دی۔ میرے لئے یہ ہدایت خوشی کا باعث تھی۔ کیونکہ اب مجھے کافی دن ہو چکے تھے کہ بچوں سے دور تھا۔ لہٰذا بچوں سے قربت کی خواہش نے فوراً بدن و روح کو بے چین کر دیا۔

کراچی واپسی

عبدالوارث صاحب نے مجھے کہا تھا کہ جانے سے قبل مکان کا انتظام کر کے جانا۔ تاکہ بچوں کو لانے پر کسی طرح کی کوئی مشکل پیش نہ آئے۔ یعنی وہ یہ چاہتے تھے کہ جو رقم انہوں نے مجھے دی ہے، اس میں سے یہاں کرائے کے مکان کا ایڈوانس وغیرہ کا معاملہ حل کر کے جاؤں۔ لیکن اس وقت کراچی پہنچنے اور بچوں سے ملنے کی خواہش اپنی انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ دوسری طرف جب میں لاہور ریلوے اسٹیشن پہنچا، تو دوسرے دن کی بکنگ نہ مل سکی، اور میں زیادہ دیر رکنا نہیں چاہ رہا تھا۔ لہٰذا ارجنٹ ٹکٹ لے کر کراچی کی ٹرین پکڑلی۔

کراچی پہنچنے پر بیوی بچوں کی خوشی دیکھ کر میری آنکھیں نم ہو گئیں۔ میرا اکلوتا بیٹا، مجھ سے لپٹ کر خوب رویا۔ اس کا کوئی بھائی نہیں ہے۔ وہ اکلوتا ہے۔ شاید اس لئے بھی وہ احساسِ تنہائی کا زیادہ شکار ہو گیا تھا۔ اس کے لہجے میں صرف ایک ہی شکوہ تھا کہ "پاپا! میں اکیلا ہوں۔ مجھے خود سے کبھی الگ مت کرنا۔ تمہارے بغیر میرا کون ہمدرد و ہمنوا ہو گا"۔ بس یہی شکوہ اس کے آنسوؤں میں، اس کی آنکھوں میں اور اس کے رونے کی آواز میں تھا، جو میں صاف طور پر پڑھ اور سُن سکتا تھا۔ لیکن میرے بھائی میرے اندر کی آہ کو نہیں سن پا رہے تھے۔ شاید بھائی اور بیٹے کی آہ میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔

کراچی آتے ہی جو پہلا کام میں نے کیا، وہ تھا گھر کا خالی کرنا۔ لیکن میں نے ایک ہی دن میں گھر خالی نہیں کر دیا تھا۔ کیونکہ میں سوچ رہا تھا کہ شاید بھائیوں میں سے کوئی مجھے روکنے کے لئے پہل کرے گا، اور یوں میں اپنے بھائیوں میں بسا رہوں گا۔ لیکن جس روز صرف رختِ سفر ہی رہ گیا تھا، تو بھائی آموجود ہوئے۔ گھر خالی تھا۔ صرف چند بیگ تھے، جو دوسرے روز ہم نے ساتھ لے جا کر ٹرین پر بیٹھنا تھا۔ بھائیوں نے روکا نہیں۔ بس ایک مطالبہ کیا، اور وہ مطالبہ تھا 50 ہزار روپے کا، جو بڑے بھائی امیر نانک کے مجھ پر رہ گئے تھے۔ میں نے کہا کہ "اپنا حقِ وراثت یہیں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ کیا یہ 50 ہزار روپے سے کم ہے؟" اس پر انہوں نے سوال کیا کہ "کہاں جا رہے ہو؟" میں نے کہا "لاہور"۔ کہنے لگے "کب؟" میں نے بتایا، "صبح"، تو سب چلے گئے۔ اب کسی طرح کی کوئی امید پالنا، دل پر بوجھ لادنے کے مترادف تھا۔ میں نے دل مضبوط کیا، اور اپنی آنکھوں کی نمی کو پلکوں کے مساموں کے ذریعے پی گیا۔

کینٹ اسٹیشن کراچی تا سٹی اسٹیشن لاہور

دوسرے روز میں اپنے بیوی بچوں کو لے کر کینٹ اسٹیشن کراچی پر تھا۔ بچوں کو شاید ابھی ادراک نہیں تھا کہ ہم کہاں اور کیوں جا رہے ہیں۔ البتہ بیوی کے چہرے فکر و تردد کے آثار موجود تھے۔ لیکن میرے دل کو پڑھنے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نے اپنے کرب کا اظہار بھی نہیں کیا تھا۔ کس سے کرتا؟ کیا کوئی تھا، جو اس دکھ کا مداوا کرتا؟ میرے بیوی بچے تو خود میرے ہی وجود سے امید لگائے بیٹھے تھے۔ میں ان کے لئے تسلی کے بجائے غمگینی کا باعث کیونکر بن سکتا تھا؟

ٹرین آئی۔ ہم بیٹھے، اور سفر شروع ہو گیا۔ بچوں کے لئے یہ پہلا تجربہ تھا کہ وہ ریل گاڑی پر سفر کر رہے تھے۔ اس لئے خداوندِ متعال کا شکر ہے کہ ان کے لئے یہ سفر انتہائی خوشگوار ثابت ہوا۔ دو دن اور ایک رات کی مسافت کے بعد لاہور آچکا تھا۔ اسٹیشن سے گاڑی کر کے ہم سیدھا "حقوق الناس دفتر" پہنچے۔ وہاں جانے کی وجہ یہ تھی کہ میں کراچی جانے سے قبل کرائے کے مکان کا بندوبست نہیں کر سکا تھا۔ یہاں تین دن قیام کے دوران مکان کا انتظام کیا۔ مکان دفتر کے قریب ہی ایک علاقے بنام "بھابھڑا" میں مل گیا۔ اگرچہ یہ مکان ناقابلِ رہایش تھا، لیکن فوری طور پر مل جانے کی وجہ سے غنیمت تھا۔

پاسٹر موسیٰ مسیح سے ملاقات

میں نے اپنے سارے سفر کی روداد سوشل میڈیا پر نہیں دی تھی، البتہ کراچی سے لاہور کی طرف ہجرت کا ذکر ضرور کیا تھا۔ اس لئے لاہور کے کئی مخلص مسیحی دوستوں نے مجھ سے ٹیلیفونک رابطہ کیا۔ ان دوستوں میں قابلِ ذکر شخصیت جناب پاسٹر موسیٰ مسیح صاحب ہیں، جنہوں نے مجھے کہا کہ وہ مجھے ملنے کے لئے وقت دیں۔ میں نے ان کو اپنے قیام کی جگہ بتائی اور ان کا انتظار کرنے لگا۔ ٹھیک پونے گھنٹے بعد وہ ماڈل ٹاؤن انڈر پاس کے قریب اپنی فیملی کے ساتھ موجود تھے۔ لیکن میں ان کو پہچان نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ میں اس سے پیشتر کبھی ان سے ملا ہی نہیں تھا۔ البتہ وہ مجھے ضرور پہچان سکتے تھے۔ کیونکہ میں نے سوشل میڈیا پر اپنی تصویریں ڈال رکھی تھیں۔ خیر میں ابھی وہاں جا کر کھڑا ہوا ہی تھا کہ ایک کار میں سے ایک خوبصورت، جوان اور دراز قد آدمی باہر نکلا اور مجھے ہاتھ کا اشارہ دینے لگا۔ میں اپنی موٹر سائیکل ایک طرف کھڑی کر کے ان کے قریب چلا گیا۔ وہ مجھے بڑے تپاک سے ملے، اور کار کے اندر بیٹھے اپنے بیوی بچوں کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ "یہ میری فیملی ہے"۔ اس کے بعد پاسٹر موسیٰ مسیح نے کار سے ایک بڑا سا تھیلا نکالا اور میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے کہا کہ "بھائی! یہ کیا ہے؟"۔ انہوں نے بتایا کہ "یہ ہماری طرف سے آپ کے لئے ایک چھوٹا سا تحفہ ہے"۔ میں نے شکریہ کے ساتھ وصول کرتے ہوئے ان سے گزارش کی کہ "گھر چلیں"۔ لیکن انہوں نے "پھر کبھی" کا کہہ کر اجازت طلب کر لی۔

داروغہ والا کی طرف منتقلی

بھابھڑے میں بڑی مشکل سے ایک ماہ گزارنے کے بعد ادارے سے منسلک کسی خیر خواہ کی طرف سے ایک مکان کی پیش کش ہوئی۔ یہ مکان داروغہ والا کی طرف تھا۔ میں نے غنیمت جانا اور وہاں منتقل ہو گیا۔ لیکن یہ دفتر سے بہت دور تھا۔ بھابھڑے میں میرے بیٹے کو یہ آسانی تھی، کہ وہ جب بھی چاہتا، میرے پاس دفتر کی طرف آ جاتا تھا۔ لیکن اب اس کے لئے یہ ناممکن تھا۔ لہٰذا وہ گھر میں بدمزگی محسوس کرنے لگا۔ بڑی بیٹی تو بہت گم سم رہنے لگی۔ کیونکہ ہنوز جب وہ ہوش سنبھال چکی تھی، تو اس کو عیسیٰ نگری میں سے اپنے رشتے داروں، اور سہیلیوں سے جدا ہونا پڑا تھا۔ اس کے لئے یہ ہجرت کسی المناک حادثے سے کم نہ تھی۔ لہٰذا اس کی ذہنی و جسمانی حالت ناگفتہ بہ ہو رہی تھی۔ وہ بات بات پر ماں سے لڑنے لگی۔ گھر میں کسی طرح کی کوئی مصروفیت نہ پا کر وہ عیسیٰ نگری میں اپنا ماضی یاد کرتی۔ اس کا ذہنی توازن متاثر ہونے لگا۔ اور بیوی کی حالت محض اس لئے بگڑنے

لگی کہ وہ بچوں کو سارا سارا دن مختلف رویوں میں گرفتار ہوتے ہوئے دیکھتی تھی۔ میں جب شام کو گھر لوٹتا تو وہ مجھے یہ سب باتیں بتاتی، جن کی وجہ سے میں بھی پریشان ہونے لگا تھا۔ لیکن کیا کرتا۔ اب یہی زندگی کا واحد راستہ تھا۔ اسی طرح زندگی کے ایام کو پورا کرنا تھا۔

میں نے کلیسا کیوں چھوڑا؟

یہ میری تقریر کا عنوان تھا۔ عید الفطر کے سلسلے میں ادارہ نے نَو مسلمین کے لئے ایک پروگرام کا انعقاد کیا۔ اس پروگرام میں مجھے بھی اپنی گواہی دینے کے لئے منتخب کیا گیا۔ میں نے ایک مختصر سی تقریر تحریر کی، اور اپنی باری پر اسے حاضرین کے سامنے بیان کر دیا۔ یہ تقریر یوٹیوب پر اب بھی موجود ہے۔

کلیسیا اور مسیحیت کے متعلق میرا یہ خیال ہے کہ دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔ کلیسیا کو چھوڑنا، مسیحیت کو چھوڑنا نہیں کہلا سکتا۔ کلیسیا ایک زمینی ادارہ ہے، جو لوگوں کے اتحاد سے تشکیل پاتا ہے۔ لیکن مسیحیت کوئی ادارہ نہیں۔ بلکہ یہ ایک نظریہ کا نام ہے، جس پر دو متضاد طبیعت رکھنے والے لوگ بھی متفق ہو سکتے ہیں۔ اس کی مثالیں خود ابتدائی شاگردوں کی زندگی سے ملتی ہیں۔ یہاں تک کہ مقدس پولوس یروشلیم کی جماعت کے افراد سے اختلاف رکھتا تھا، جس کے نتیجے میں یروشلیم سے دور انطاکیہ میں ایک نئی کلیسیا کا وجود رونما ہو گیا۔ لیکن دونوں جماعتیں ایک ہی شخص "یسوع" سے منسوب تھیں۔ اگرچہ ان کے اعتقادات میں کافی کچھ فرق تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اپنی تقریر کا عنوان "میں نے کلیسا کیوں چھوڑا؟" رکھا۔ حالانکہ تقریر کا عنوان "میں نے مسیحیت کیوں چھوڑی؟"، یا "میں نے اسلام کیوں قبول کیوں کیا؟" وغیرہ بھی ہو سکتا تھا۔

میں نے اس تقریر میں واضح طور پر بتایا کہ مجھے اسلام کی طرف دھکیلنے والے خود مسیحی لوگ تھے۔ خود بااثر مسیحی افراد نے مجھے اسلام قبول کرنے کے لئے مجبور کیا۔ کلیسیا نے جو نظامِ معاشرت قائم کر رکھا تھا، اس نے پاکستانی مسیحی عوام کو ایک انتہائی افسوس ناک طرزِ زندگی کا عادی بنا رکھا تھا۔ اس نظامِ معاشرت میں انجیلی تصورِ حیات مفقود تھا۔ شراب، سود، زنا، چوری، رذیل ذرائعِ معاش اور کئی قبیح رسوم نے اس معاشرت کو اخلاقی طور پر دیوالیہ کر رکھا تھا۔ اگر کلیسیا حقیقی طور پر مسیحیت کی نمائندگی کرتی، تو معاشرے میں ضرور اس کے نشانات پائے جاتے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے کلیسیا چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ بعض لوگوں نے کلیسیا کو خیرباد کہنے سے مراد یہ لی کہ میں نے مسیحیت کو چھوڑ دیا ہے۔ میرے خیال میں وہ شدید غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔

بچوں کی کراچی واپسی

بہت سوچ بچار کے بعد میں نے بیوی سے مشورہ کیا کہ اپنی والدہ کو فون پر یہ مسائل بتاؤ، اور ان سے قریب ہی کسی کرائے کے گھر کی درخواست کرو۔ کراچی میں کم از کم بچوں کو ننھیال تو میسر آئیں گے۔ ورنہ لاہور میں تو ان کا گزارہ مشکل ہو جائے گا۔ آخر کار بیوی نے رو دھو کر اپنی والدہ کو اس بات کے لئے قائل کر لیا۔ میں نے بیوی بچوں کے لئے کراچی کی بکنگ حاصل کر لی، اور دو دن بعد ان کو رخصت کر دیا۔ اس دوران میں خود ایک جامعہ میں طلبا کے ساتھ رہایش پذیر ہو گیا۔ کیونکہ مکان میں دیگر تین فیملیاں رہاش پذیر تھیں، اور ان کے درمیان میرا اکیلے کا وہاں رہنا مناسب نہ تھا۔

ایم اے کے امتحانات

اسی دوران میرے ایم اے کے امتحانات بھی متوقع تھے۔ میں نے جامعہ میں رہتے ہوئے ان کے لئے تیاری شروع کر دی۔ جولائی 2019ء میں ادارے کی طرف سے بیس روز کی رخصت لے کر کراچی آ گیا۔ یہاں آنے سے پیشتر میں نے اپنے شیعہ دوست احمد فاطمی سے درخواست کی کہ میرے قیام کا انتظام کرے۔ اس نے بڑی خوشی سے یہ درخواست قبول کر لی، اور مجھے خوش آمدید کہا۔ کراچی میں احمد فاطمی کے ساتھ رہتے ہوئے میں بیوی بچوں سے بھی ملتا رہا، اور فاطمی کے علاقے میں بعض افراد کے ساتھ بھی اچھی سلام دعا پیدا کر لی۔ یہی وجہ تھی کہ جب میں دوبارہ کراچی آیا تو مجھے اس علاقے میں فوری طور پر کرائے کا فلیٹ مل گیا۔

امتحانات کے دوران میرے سسرال والوں کی طرف سے مجھے سمجھایا جاتا رہا کہ میں واپس آ جاؤں اور اپنے بیوی بچوں کے ساتھ کراچی ہی میں کہیں مسکن بنا لوں۔ لیکن میرے لئے یہ سب کچھ کرنا اتنا آسان نہیں تھا۔ لہٰذا میں نے ان سے درخواست کی کہ مجھے کچھ وقت دیں۔ تا کہ میں بکھرے ہوئے معاملات کو سمیٹ سکوں۔ پھر شاید یہ سب کچھ ممکن ہو جائے۔ اس طرح میں نے ان کو مجبور کیا کہ وہ مجھے واپس لاہور جانے دیں۔ میری بیوی نے بجبوری مجھے لاہور واپسی کی اجازت دے دی مگر اس نے یہ شرط رکھ دی کہ اپنی موٹر سائیکل یہیں چھوڑ کر جاؤ۔ میں نے بہت سمجھایا کہ اتنے بڑے شہر میں بغیر موٹر سائیکل

کے کیسے معاملات چلا پاؤں گا۔ لیکن وہ بھی اپنی ضد پر اڑی رہی۔ آخر کار میں نے اس کی شرط مان لی، اور موٹر سائیکل کے بغیر ہی لاہور واپس آ گیا۔

لاہور میں مشکلات

واپس لاہور پہنچنے پر سب سے پہلی مشکل، جو مجھے پیش آئی، وہ تھی وقت پر دفتر اور مدرسے پہنچنا۔ اگست کا مہینہ تھا۔ اگرچہ بارشیں ہو رہی تھیں، لیکن پیدل چلنے والوں کے لئے گرمی ابھی موجود تھی۔ میرے پاس صرف تین عدد شلوار قمیض سوٹ تھے، جو ہجرت کے ایک ماہ بعد عبد الوارث بھائی نے مجھے سلوا کر دیئے تھے۔ لیکن یہ کپڑے جس وقت سلوائے گئے تھے، تب موسم سرد تھا، اور یہ موسم کے اعتبار سے ہی کار آمد تھے۔ لہٰذا ان کپڑوں کو اگست میں پہن کر پیدل سفر کرنا میرے لئے کوفت و اذیت کا باعث ہو رہا تھا۔ ہفتے بھر میں ہی مجھے دفتر کی طرف سے یہ شکایت کر دی گئی کہ میں وقت پر کہیں بھی نہیں پہنچ پا رہا۔

بالآخر چند دن کے بعد عبد الوارث صاحب نے مجھے سرزنش کرتے ہوئے دفتر اور مدرسہ سے الگ ہو جانے اور کوئی کار و بار شروع کرنے کا عندیہ دے دیا۔ اس کے لئے انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ مجھے ایک عدد موٹر سائیکل اور کار و بار شروع کرنے کے لئے درکار رقم بھی دیں گے۔ لیکن میں کاروباری بندہ نہیں تھا۔ اگرچہ کراچی میں مجھے اسکولوں میں پڑھانے، بینرز لکھنے، اور کتابیں فروخت کرنے کا تجربہ تھا۔ لیکن ان کاموں میں مجھے کوئی زیادہ قباحت محسوس نہ ہوتی تھی۔ البتہ کوئی کار و بار شروع کرنا، اور پھر اس کو مستقل چلانا، بجائے خود ایک ایسا کام تھا، جس میں دن رات کی توجہ درکار تھی۔ پھر اس کا مجھے پہلے سے کوئی خاص تجربہ بھی نہیں تھا۔ جو تھوڑا بہت عام تجربہ بینرز لکھنے یا کتابیں فروخت کرنے کا تھا، وہ بہت آسان تھا۔ کیونکہ بینرز کا کام روز روز نہیں ملتا تھا۔ اسی طرح کتابوں کی فروخت کا عمل بھی ہفتے میں ایک ہی روز ہوا کرتا تھا۔ تاہم ان دونوں کاموں سے مجھے فائدہ یہ تھا کہ میں ایک ایک دن میں ہفتے یا آدھ مہینے کے اخراجات کی رقم حاصل کر لیا کرتا تھا۔ اس لئے میری طبیعت کوئی اسی قسم کا کام کرنے میں لگ سکتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب ادارے نے مجھے "مسیحی فرقوں" پر کام دیا تو میں نے اسے بخوشی شروع کر دیا تھا۔

خیر اب میرے سامنے ایک نئی آزمایش سر اٹھائے یا پھن پھیلائے کھڑی تھی۔ میں نے چار و ناچار کار و بار شروع کرنے کی حامی بھر لی، اور ان کی طرف سے موٹر سائیکل اور درکار رقم کا انتظار کرنے لگا۔ یہ بڑی عید کے دن تھے، اور میں داروغہ والا کے قریب جامعہ ہی میں مقیم تھا۔ اب مجھے دفتر سے الگ کر دیا گیا تھا، اور یہاں جامعہ میں بھی میرا قیام بلا جواز تھا۔

البتہ میرے جامعہ میں قیام پر نہ تو کسی نے کوئی اعتراض کیا تھا اور نہ ہی کسی نے مجھے کوئی تکلیف پہنچائی تھی۔ عید میں چند دن باقی تھے، اور طلباء کو عید کی چھٹیاں مل گئی تھیں۔ انہی دنوں طلبا میں سے دو تین لڑکے مجھ سے مانوس ہو گئے۔ ان میں سے ایک لڑکا پاکپتن کا نعیم تھا۔ اس نے میری اداسی کو محسوس کرتے ہوئے مجھے اپنے ساتھ گاؤں چلنے کی صلاح دی۔ میں اس کے ساتھ چلا گیا۔ لیکن دوسرے دن ہی میں داروغہ والا واپس آ گیا۔ حالانکہ نعیم کے خاندان کے لوگوں کی طرف سے مجھے بہت محبت و شفقت میسر آئی تھی۔ تاہم میرا دل مطمئین نہیں تھا کہ میں عید تک یہاں اس پر یا اس کے خاندان پر بوجھ بنوں۔

کراچی کی طرف واپسی

اس دوران میں نے محسوس کیا کہ ادارے کی طرف سے مجھے کوئی مثبت تاثر نہیں دیا جا رہا۔ اس کی وجہ ایک تو یہ تھی کہ عید سر پر تھی، اور عید کی خوشیوں میں شامل ہونے کے لئے مجھے کوئی موقع فراہم نہیں کیا گیا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ کم از کم مجھے ایک موٹر سائیکل ہی دے دی جاتی۔ تا کہ میں فراغت کے ان ایام میں گھوم پھر کر جی بہلا سکتا۔ خیر یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے میں نے اپنی بیوی کو اس بات کے لئے قائل کر لیا کہ وہ موٹر سائیکل مجھے بھیج دے گی تو میں کچھ ضروری کام نپٹا کر موٹر سائیکل پر ہی واپس آ جاؤں گا۔ لہٰذا میں نے سرجانی میں مقیم اپنے دوست جناب حیدر شیرازی کو درخواست کی کہ موٹر سائیکل لے کر کراچی کینٹ اسٹیشن پر بلٹی کروا دے۔ اس طرح دو دن کے بعد موٹر سائیکل میرے پاس تھی۔ میں نے ضروری سامان باندھا اور کراچی کے لئے بلٹی کروا دیا۔ پھر کچھ کتابوں کو باندھ کر موٹر سائیکل پر لٹکایا اور 11 اگست بروز اتوار کو صبح 5 بجے جامعہ سے ٹھوکر نیاز بیگ کی طرف چل پڑا۔ تقریباً صبح کے 6 بج رہے تھے، جب میں نے ٹھوکر نیاز بیگ اڈے پر آ کر ناشتہ کیا تھا، اور ٹھیک اسی وقت موٹر سائیکل کو ملتان روڈ پر ڈال کر سفر شروع کر دیا۔ راستے میں نشان ہائے راہ پڑھتے ہوئے اور بوقتِ ضرورت پوچھتے ہوئے میں رات 9 بجے احمد پور شرقیہ پہنچ گیا۔ یہ سفر مسلسل تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عید کی چھٹیوں کی وجہ سے موٹر وے اور ہائی وے پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس لئے میں بھی موٹر سائیکل اڑاتا ہوا محوِ سفر رہا۔

سفر کی پہلی رات احمد پور شرقیہ کے ایک بڑے سے ہوٹل پر گزاری۔ یہاں بڑی بڑی چارپائیاں رکھی ہوئی تھیں۔ غالباً یہ ان ٹرک ڈرائیوروں کے لئے تھیں، جو رات بھر سفر کرتے تھے، اور جن کے باعث یہ ہوٹل چلتے ہیں۔ خیر میں نے ایک طرف کھلے میدان میں پڑی آخری چارپائی کی طرف موٹر سائیکل کھڑی کی، لاک لگایا اور چارپائی پر دراز ہو گیا۔ لیٹتے ہی جیسے میرا جسم پر سکون ہونا شروع ہو گیا تھا۔ کیونکہ مسلسل سفر کے باعث میری کمر تھک چکی تھی، اور پیٹھ درد سے بھر گئی تھی۔ اس

عمر میں درد کی شدت اس وجہ سے بھی تھی کہ 1998ء میں پولیس نے مجھ پر بہت تشدد کیا تھا، جس کا ذکر میں نے اوپر بھی کیا ہے۔

تھوڑی دیر لیٹنے کے بعد میں نے ویٹر کو کھانا لانے کے لئے کہہ دیا، اور خود ہاتھ منہ دھونے کے لئے نلکے کی طرف چلا گیا۔ واپس آیا تو چارپائی پر کھانا پڑا ہوا تھا۔ میں نے کھانا کھایا، اور چائے کے لئے کہہ دیا۔ چائے میں تھوری دیر ہو گئی، اور مجھے خبر ہی نہ ہوئی کہ میں کب گہری نیند میں سو گیا۔

صبح سویرے تقریباً 4 بجے آنکھ کھلی تو چائے کی خوشبو محسوس کی۔ دیکھا تو چھپرے کے نیچے ایک شخص چائے بنانے میں مصروف تھا۔ غالباً یہاں رات بھر ڈرائیوروں کے لئے چائے کا اہتمام جاری رہتا تھا۔ میں نے منہ ہاتھ دھوئے، اور چائے کے لئے آرڈر دے دیا۔ چند منٹوں میں چائے آگئی۔ لڑکے نے کہا کہ جناب! رات کو بھی میں اتنی ہی جلدی چائے لے آیا تھا، لیکن آپ خراٹے لے رہے تھے۔ اس پر میں صرف مسکرا کر رہ گیا۔ اس کے بعد میں نے چائے پی اور بل ادا کر کے موٹر سائیکل کی طرف بڑھا۔ موٹر سائیکل جوں کی توں ہی کھڑی تھی، جیسی کہ میں نے رات کو چھوڑی تھی۔ سب کچھ مکمل اور محفوظ تھا۔ اس پر میں نے کلمۂ شکر ادا کیا اور آگے کے سفر کو شروع کر دیا۔

میرا دوسرا پڑاؤ سعید آباد تھا، جہاں میں تقریباً 8 بجے تک پہنچ چکا تھا۔ ایک ہوٹل کو منتخب کیا، اور کھانا کھا کر ایک چارپائی پر دراز ہو گیا۔ یہاں بھی مجھے جلد ہی نیند آگئی۔ صبح پھر 4 بجے سفر پر روانہ ہو گیا۔ جلد ہی حیدر آباد پہنچ گیا۔ یہاں بکرا پیڑھی تک آیا تو سوچا کہ فرمان شیخ سے ملتا جاؤں۔ لیکن پھر ارادہ بدل دیا۔ کیونکہ اب میں کافی تھکن محسوس کر رہا تھا، اور کراچی بھی اتنا دور نہیں تھا۔ البتہ میں نے بکرا پیڑھی پر چنے چاول سے ناشتہ کیا، اور موٹر سائیکل کا رخ کراچی کی طرف موڑ دیا۔ دن 11 بجے کے قریب میں نئی سبزی منڈی کے پاس تھا۔ وہاں سے ایک راستہ گلشنِ معمار کی طرف مڑتا ہے، جو سیدھا نیو کراچی کی طرف نکلتا ہے۔ یہاں سے میں نیو کراچی پہنچا اور سب سے پہلے جناب اعجاز غوری صاحب کے ذریعے فلیٹ کا انتظام کیا۔ دوسرے دن بیوی بچوں کو لے کر فلیٹ میں منتقل ہو گیا۔ بیوی بچے خوش بھی تھے، اور غمزدہ بھی۔ یقیناً وہ یہ سوچ رہے تھے کہ آخر یہ مشکل اور اذیت کے دن کب ختم ہوں گے۔ کب ایسا دن آئے گا کہ ہم ایک ساتھ ایک مستقل گھر میں زندگی کی خوشیوں کا نظارہ کریں گے۔

موٹر سائیکل کی نیلامی

فوری طور پر جس فلیٹ کا انتظام ہوا تھا، اس کا جاری ماہ کا کرایہ دیا گیا تھا۔ کیونکہ میرے پاس پیسے ختم ہو چکے تھے۔ جو پیسے میں نے لاہور سے اپنی بیوی کو بھیجے تھے، انہی میں سے بچا کر اس نے کوئی آٹھ ہزار روپے رکھے ہوئے تھے۔ میں نے اعجاز بھائی سے کہا کہ آپ فی الحال جاری ماہ کا کرایہ لے کر فلیٹ دلوا دیں۔ ایڈوانس کی رقم میں دو ماہ میں ادا کر دوں گا۔ میری درخواست تو مان لی گئی تھی۔ لیکن میں دو ماہ میں ایڈوانس کی رقم دینے میں ناکام ہو گیا تھا۔ ادھر مالک مکان مسلسل ایڈوانس کا مطالبہ کرنے لگے۔ اب کوئی اور ذریعہ نہیں تھا سوائے اس کے کہ میں اپنی موٹر سائیکل کو بیچ دوں۔ لہٰذا میں نے اپنے بیٹے کو ساتھ لیا، اور اکبر مارکیٹ صدر کراچی میں جا کر موٹر سائیکل کو نیلام کر دیا۔

یہ موٹر سائیکل میں نے 2017ء میں خریدی تھی۔ ماڈل بھی 17ء کا ہی تھا۔ یہ مجھے کوئی 66 ہزار میں پڑی تھی۔ صرف ڈیڑھ سال ہی استعمال کر پایا تھا کہ اسے آج بیچنے کی نوبت آ گئی تھی۔ میرا بیٹا موٹر سائیکل چلانے کا بہت شوق رکھتا ہے۔ وہ اکثر کہتا ہے کہ "پاپا! مجھے کب سکھاؤ گے؟"۔ چونکہ ابھی وہ دس سال کا ہے، اس لئے میں اسے کہتا ہوں کہ "جب تم 18 سال کے ہو جاؤ گے تو نہ صرف موٹر سائیکل سکھا دوں گا بلکہ ایک نئی موٹر سائیکل بھی لے کر دے دوں گا"۔ وہ یہ سن کر خوش ہو جاتا ہے۔

لیکن آج جب میں اس موٹر سائیکل کو بیچنے کے لئے آ گیا تو میرے دل میں یہ خیال آیا کہ بیٹا یقیناً اس بات کو محسوس کر رہا ہو گا کہ "پاپا اپنی موٹر سائیکل کو بیچنے کے لئے آ گیا ہے، تو میرے لئے موٹر سائیکل کیسے اور کب خرید کر دے گا؟" یا وہ یہ سوچتا ہو گا کہ "اب میں موٹر سائیکل کیسے سیکھوں گا؟ یہ تو بِک رہی ہے"۔

غربت و افلاس کی وحشت

موٹر سائیکل بیچ کر فلیٹ کا ایڈوانس تو دے دیا، لیکن ملازمت کے حصول میں مسلسل ناکامی ہو رہی تھی۔ نئے پرانے سارے رابطے آزمائے۔ مگر کوئی کام نہ آیا۔ ایک دن عبد الوارث صاحب نے ٹیلیفون کیا، اور پوچھا کہ کس حال میں ہوں۔ میں نے بتایا، تو انہوں نے کراچی ہی میں ملازمت کے لئے امید دلا دی۔ لیکن دو تین ماہ تک ملازمت نہ ملی۔ میں نے کراچی آنے پر کتابوں کی فروخت کا کام تو شروع کیا تھا، جس سے نان و نفقہ میسر ہونے لگا تھا۔ لیکن اب موٹر سائیکل نہ ہونے کے باعث وہ بھی بند ہو گیا تھا۔ ایک ماہ کی تگ و دو کے بعد بھی جب کوئی ملازمت نہ ملی تو مجبوراً مجھے چالیس ہزار روپے مالیت کا فریج اٹھارا ہزار

روپے میں بیچنا پڑ گیا۔ کیونکہ نئے ماہ کا کرایہ ادا کرنے کی تاریخ سر پر آن پہنچی تھی۔ لاہور کی طرف ہجرت کے دوران بڑا بڑا سامان میں نے سسرال میں رکھوا دیا تھا۔ فریج بھی وہیں رکھی تھی۔ لیکن یہ فریج ہی ایک ایسی شئے تھی، جو فروخت کے قابل تھی۔ اس کے بعد کوئی بھی ایسی شئے موجود نہ تھی، جسے بیچ کر مزید کسی طرح سے زندگی کی کاڑی کو آگے دھکیلا جا سکتا ہو۔

ایک اتوار میں نے بچی کھچی کتابوں کو باندھا، اور رکشہ میں لاد کر ریگل لے گیا۔ ایک اسٹال والے سے ادھار پیسے لے کر رکشے کا کرایہ ادا کیا۔ شام تک کوئی تین ہزار روپے کما پایا۔ ادھار چکانے کے بعد باقی کتب کو باندھ کر بس کے ذریعے گھر واپس پہنچا۔

اسی طرح ایک دن اردو بازار میں کسی کی طرف کچھ رکے ہوئے پیسے لینے جانا پڑا۔ لیکن جیب میں پہنچنے کے لئے کرایہ تک نہیں تھا۔ بیوی نے بتایا کہ اس کے پاس کوئی سو روپے تک پڑے ہیں۔ میں نے سوچا کہ اگر میں یہ پیسے لے کر بازار چلا جاؤں تو بچوں کا دن کیسے گزرے گا۔ یہ خیال آتے ہی میں نے پیدل سفر کا ارادہ کیا، اور گھر سے نکل پڑا۔ اللہ والی نیو کراچی سے کریم آباد تک پہنچتے ہوئے کوئی 10 بج گئے۔ یہاں میرے ایک بزرگ محسن جناب سید سخاوت الوری صاحب رہایش پذیر تھے۔ میں نے ان سے ملاقات کی اور بتایا کہ نیو کراچی سے پیدل چل کر آیا ہوں، اور ابھی مزید اردو بازار تک جانا ہے۔ انہوں نے حیرت و ترحم کے جذبات میں مجھے ڈانٹا اور کچھ روپے دیتے ہوئے فرمایا کہ جب بھی ایسی کوئی صورتحال درپیش ہو، تو بتایا کرو۔

انہی دنوں مجھے ایک ٹیلفون کال موصول ہوئی۔ یہ حلقہِ اربابِ ذوق کے ایک شاعر جناب حجاز مہدی صاحب تھے۔ انہوں نے ملاقات کا ارادہ ظاہر کیا، اور گرومندر کے ایک ہوٹل پر بلوالیا۔ ملاقات ہوئی۔ انہوں نے ایک کتاب بنام "خطباتِ لندن" مجھے دکھائی۔ یہ انگریزی میں تھی۔ انہوں نے بتایا کہ اس میں عبرانی متن سے حوالے دے کر "شیعہ عقائد" کو بائبل میں سے ثابت کیا گیا ہے۔ اس کے لئے ہمیں آپ کی خدمات درکار ہیں۔ میں نے فوراً اس کے لئے حامی بھر لی۔ یہ کام کوئی سترہ ہزار روپے میں طے پایا۔ جس کی رقم تین اقساط میں ادا ہونا قرار پائی۔ میں نے سوچا کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے۔ میں نے یہ کام ہفتے بھر میں کر کے انہیں دے دیا۔

اس کے کچھ دنوں بعد مجھے ایک اَور ٹیلیفون کال موصول ہوئی۔ یہ بسم اللہ بک ہاؤس کے مالک جناب خلیل ملک صاحب تھے۔ انہوں نے مجھے ملاقات کے لئے کہا، جو کہ میرے اردو بازار پہنچنے پر ہو گئی۔ کچھ تعارفی گفتگو کے بعد انہوں نے مجھے "مسیحی فرقوں" پر اس کام کو مکمل کرنے کی ہدایت کی، جو لاہور کے ادارے حقوق الناس میں نامکمل رہ گیا تھا۔ لیکن اس کی تکمیل کے لئے انہوں نے مجھے وقت بہت کم دیا۔ اب اتنا بڑا موضوع ایک ماہ میں تو مکمل ہونے سے رہا۔ بہر حال مجھے پیسوں کی اشد ضرورت تھی۔ اس لئے میں نے اس کام کی تکمیل کے لئے ان سے کچھ ایڈوانس کا مطالبہ کر دیا، جسے انہوں نے منظور کیا۔ میں نے بچوں کے لئے کچھ ضروری اشیاء خریدیں، اور کام کرنے کے لئے بیٹھ گیا۔ اس دوران کوئی دو تین بار خلیل صاحب سے

پیسے مانگنے کی نوبت آئی۔ کام مکمل کیا اور ان کو تھما دیا۔ انہوں نے مزید کسی کام کے لئے کہا، تو "عبرانی اردو لغت" پیش کر دی۔ یوں میں نے دو ماہ مزید بیوی بچوں کی بنیادی ضروریات کو مہیا کر لیا۔

بھائیوں سے ملاپ کی کوشش

اب میری کوشش یہ تھی کہ اس قسم کے چند ایک کام مزید مل جائیں تو زندگی کی دوڑ میں میرے بچے بھی شامل ہو سکتے ہیں۔ ان کی تعلیم و تربیت کے اخراجات اور گھر کی دال روٹی کا سلسلہ چل پڑے گا۔ انہی دنوں میرے سسرال والوں کی طرف سے مجھ پر دباؤ ڈالا گیا کہ ایک بار اپنے بھائیوں سے ملاقات کروں اور ان سے صلح کرنے کی کوشش کروں۔ اگرچہ مجھے معلوم تھا کہ نتیجہ کیا نکلے گا۔ پھر بھی میں اس کے لئے راضی ہو گیا، تاکہ سسرال والے کل کو یہ نہ کہیں کہ اگر تم کوشش کرتے تو تمہارے بچوں کو گھر کی چھت نصیب ہو سکتی تھی۔ ایک دن میں، میری بیوی بچے اور میرے سسرال کے چند بڑے، عیسیٰ نگری پہنچ گئے۔

ادھر چاروں بھائی بھی موجود تھے، اور ان کے ساتھ دو چار رشتے دار بھی آئے ہوئے تھے۔ مدعا سامنے رکھا گیا۔ میں نے بے قصور ہوتے ہوئے بھی کھڑے ہو کر ہاتھ باندھ لئے، اور سب سے معافی کی طلب کی۔ حتیٰ کہ میری بیوی کی حالت غیر ہو گئی، اور اس نے روتے ہوئے پاگلوں کی طرح سب کے پاؤں کو ہاتھ لگا لگا کر معافی مانگنا شروع کر دی۔ لیکن یہاں تو جیسے سب اپنے سینوں کو خالی کر کے بیٹھے ہوئے تھے، اور دلوں کی جگہ سمندری پتھر نصب کئے ہوئے تھے۔ کسی نے ذرہ بھر بھی رحم نہ کھایا۔ کسی کو کچھ ترس نہ آیا۔ مایوس ہو کر ہم واپس آ گئے۔

بے انصاف قوم سے امید اور مایوسی

میرا اصل مسئلہ یہ ہرگز نہیں تھا کہ مجھے لازمی طور پر میرا گھر واپس مل جائے۔ یا میرے بھائی میرے حصے کے لئے کوئی اچھی خاصی رقم مجھے دے دیں۔ بلکہ میرا اصل مسئلہ یہ تھا کہ لوگ مجھ پر لگے جھوٹے الزامات، اور میرے خلاف ہونے

والی اس سازش کو سمجھ جائیں۔ اس کے لئے میں نے سوشل میڈیا پر بہت احتجاج کیا۔ لیکن اس قوم کا نہ کوئی فرد میری آواز پر کان دھرنے کو راضی ہوا، اور نہ ہی کوئی ادارہ۔

یہاں میں یہ بات ضرور کہنا چاہوں گا کہ جس قوم کو میں قوم سمجھتا رہا۔ دراصل وہ ایک ہجوم نکلا، جسے ایک مخصوص طبقہ ہانک رہا ہے، اور اپنی سیاست کے لئے استعمال کر رہا ہے۔ اگر یہ کوئی قوم ہوتی تو ان کا ایک تصورِ حیات اور نظامِ معاشرت ہوتا، جس سے اس کی کوئی الگ پہچان ہوتی۔ لیکن یہاں تو کہانی ہی کچھ اور تھی۔ جو قوم اسکولوں کی بجائے شراب خانے کھولنے پر زیادہ سرگرم ہو، اس کے پاس ان اعلیٰ وارفع چیزوں کا فقدان نہ ہو گا، تو اور کیا ہو گا۔

الزامات اور جوابات

اس قوم کی جہالت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ چند منشیات فروش ایک صحافی کو میری شکایت کر کے کہتے ہیں کہ بشیر جَون ہمارے خلاف سوشل میڈیا پر انکشافات کرتا رہتا ہے، جس سے ہماری عزت مٹی میں مل رہی ہے، اور بیرونِ ملک شہریت خریدنے کی ہماری تمام کوششیں ناکام ہو رہی ہیں۔ براہِ مہربانی کوئی ایسا حل نکالیں کہ ہماری عزت پر لگنے والے اس دھبے کو صاف کیا جا سکے۔ صحافی چند مزید لوگوں سے مشورت کرتا ہے۔ بالآخر یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ اگر بشیر جَون خود کسی طرح سے مجرم ثابت ہو جائے تو اس کی باتوں پر یقین کرنے کے امکانات کم ہو سکتے ہیں۔

لہٰذا چند جھوٹے صحافی، چند جعلی بشپ اور چند سماجی و سیاسی غنڈے سر جوڑ کر میرے خلاف ایک ترکیب بنانے میں کامیاب ہو گئے۔

پہلا الزام:

منشیات فروشوں نے یہ افواہ پھیلائی کہ بشیر جَون ایک منشیات فروش گھرانے کی ایک لڑکی کو پسند کرتا تھا، لیکن رشتہ نہ ملنے پر اس نے اس فیملی کو دنیا کے سامنے بدنام کرنا شروع کر دیا ہے۔

الزام کا جواب:

اس الزام کا جواب یہ ہے کہ اگر معاملہ یہی تھا تو پھر اخباروں میں ان منشیات فروش عورتوں اور مردوں کے متعلق چھپنے والی کرائم رپورٹروں کی خبروں کی بنیاد کیا ہے۔ کیا اکیلا بشیر جَون اتنے سارے صحافیوں کو خریدنے کی پوزیشن میں ہے کہ وہ ان منشیات فروشوں کے خلاف ان کے ناموں سے خبریں شائع کروائے؟ یا تھانے میں سرکاری طور پر جو مقدمات ان منشیات فروشوں کے نام سے درج ہیں، کیا بشیر جَون نے درج کروائے ہیں؟ کیا وہ اس پوزیشن میں ہے کہ صحافیوں کے ساتھ ساتھ تھانے کو بھی خرید لے؟

دوسرا الزام:

دوسرا الزام یہ لگایا گیا کہ بشیر جَون علاقے کے منشیات فروشوں کو بلیک میل کرنا چاہتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ ان کے خلاف سوشل میڈیا پر مواد ڈال رہا ہے۔

الزام کا جواب:

اس الزام کا جواب یہ ہے کہ کیا بلیک میل کرنے کے لئے صرف منشیات فروشی کا ہی الزام کافی ہوتا ہے؟ کیا اکیلا شخص بیک وقت بہت سارے افراد کو بلیک میل کرنے کے لئے اعلانیہ چیلنج کر سکتا ہے؟ پھر ایسے افراد، جن کے متعلق کافی ثبوت موجود ہوں، کیسے کسی کو اس بات کے لئے الزام دے سکتے ہیں کہ ان کو محض بلیک میل کرنے کی غرض سے بدنام کیا جا رہا ہے؟ عقلِ سلیم کسی بھی طرح سے اس الزام کو سچ تسلیم نہیں کر سکتی۔

تیسرا الزام:

تیسرا الزام، جو لگایا گیا، وہ یہ ہے کہ بشیر جَون کراچی سے ایک لڑکی کو بھگا کر لاہور لے گیا، اور وہاں اسلامی شریعت کے تحت شادی کر لی۔

الزام کا جواب:

اس الزام میں بھی کسی طرح کی صداقت کو ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً کیا صحافی یہ ثابت کر سکتا ہے کہ کراچی میں واقعی کوئی لڑکی بشیر جَون کے ساتھ بھاگی ہے؟ کیا صحافی یہ ثابت کر سکتا ہے کہ اس کی خبر باقاعدہ کسی تھانے میں درج کرائی گئی

شکایتی رپورٹ کے مطابق ہے؟ کیا صحافی کوئی شرعی یا کورٹ کا نکاح نامہ پیش کر سکتا ہے، جس کے مطابق اس کی خبر سچ ثابت ہوتی ہو؟ کیا صحافی یہ ثابت کر سکتا ہے کہ اس کی خبر باقاعدہ کسی معتبر ذریعہ سے حاصل کی گئی تھی؟

میرے خیال میں یہ سوالات صحافی کو جھوٹا ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں۔ لیکن افسوس کہ اس صحافی کے خلاف کسی برادری پنچایت نے کوئی فیصلہ نہیں دیا۔ عوام الناس نے اس کی خبر کو محض پڑھ کر بشیر جَون سے نفرت شروع کر دی ہے۔ پھر کوئی بتائے کہ یہ قوم جاہل کے خطاب کی اہل ہے یا نہیں؟ محض ایک جھوٹی خبر کی بنیاد پر کسی شخص کی زندگی کے سارے خوابوں کو خاک میں ملا دینا کون سی دانش مندی ہے؟ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ جھوٹے خبر چھاپنے والے توجوں کے توں قوم کے ہیرو بنے رہیں، اور جس کے بارے جھوٹی خبر چھاپی گئی ہے، وہ بیوی بچوں سمیت گھر، برادری اور مذہب سے خارج کر دیا جائے؟ اس لئے میں کہتا ہوں کہ یہ قوم، قوم نہیں بلکہ ہجوم ہے۔ یا شاید جانوروں کی طرح ایک ریوڑ ہے۔ اگر پھر بھی یہ قوم ہی کہلانا چاہتی ہے تو پھر یہ بہت بے انصاف قوم ہے۔

مایوسی کے ایام

اب میری زندگی کا ایک اور دل خراش دور شروع ہوا۔ فلیٹ مالک نے فلیٹ خالی کرنے کا عندیہ دے دیا۔ کرائے، اور بِل وغیرہ کے واجبات ایڈوانس کے پیسوں میں کٹ گئے۔ بقیہ ایک روپیہ بھی نہ ملا۔ فلیٹ خالی کرنے میں صرف چند روز کا وقت تھا، اور پیسے نہیں تھے۔ میں نے ایک موبائل ایس ایم ایس (SMS) ٹائپ کیا، اور اپنے پاس موجود تمام موبائل نمبروں پر ارسال کر دیا۔ اس ایس ایم ایس کے الفاظ یوں تھے؛

"I am dead economically".

اس ایس ایم ایس کو پڑھتے ہی مجھے ایک کال موصول ہوئی۔ یہ تھے جناب شبیر شفقت صاحب، جو نیشنل کرسچن پارٹی کے بانی وچیئرمین ہیں۔ انہوں نے مجھے کہا کہ اپنا شناختی کارڈ نمبر بھیجو۔ میں نے فوراً بھیج دیا۔ کچھ دیر بعد مجھے پانچ ہزار روپے کی موصولی کا پیغام آ گیا۔ میں نے پیسے نکلوائے، اور سب سے پہلے شبیر شفقت صاحب کا شکریہ ادا کیا، جس پر انہوں نے مجھے ملازمت کی امید دلوائی۔

ابھی شبیر شفقت صاحب کی طرف سے ملنے والے پیسے ختم بھی نہ ہوئے تھے کہ مجھے سرجانی کی طرف ایک مشنری اسکول میں پرنسپل کی کرسی مل گئی۔ اس ملازمت کے لئے بھی شبیر شفقت صاحب نے ہی راہ نکالی تھی۔ اسکول کے سربراہان سے ملاقات ہوئی، اور ملازمت پکی ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے مجھے موٹر سائیکل کے لئے پندرہ ہزار روپے ایڈوانس بھی

دے دیئے۔ میں نے فوری طور پر ایک استعمال شدہ موٹر سائیکل حاصل کی، جو مجھے تقریباً تیرہ ہزار روپے میں ملی۔ اگرچہ یہ اتنے پیسے تھے کہ میں فوراً متبادل فلیٹ لے سکتا تھا۔ لیکن میرے دل میں خیال آیا کہ کیوں نہ موٹر سائیکل لے لی جائے۔ تاکہ بھاگ دوڑ کر کے متبادل فلیٹ کے لئے انتظام کر سکوں۔ اور پھر ابھی فلیٹ خالی کرنے میں کچھ دن باقی تھے۔

بائبل کا پنجابی ترجمہ

انہی دنوں میرے دوست جناب بنجمن پاسکل عدیدؔ صاحب نے مجھے کال کی اور ترجمے کے حوالے سے ایک کام کی پیش کش کی۔ میں نے حامی بھر لی۔ یہ کام بائبل مقدس کے پنجابی ترجمے کا تھا، جسے ویکلف ایسوسی ایشن کی طرف سے پاکستان میں جناب سلمون صاحب سرانجام دینے کے لئے منتخب ہوئے تھے۔ ترجمے کے شرکاء میں توقیر چغتائی، عارف پرویز نقیب، جانسن منشاء، پاسٹر جیمس ماہنا، بنجمن پاسکل عدیدؔ اور چند دیگر ساتھی بھی شامل تھے۔

پہلے دن کی حاضری میں جناب سلمون صاحب نے مجھ سے چند ضروری سوالات کئے، جن کے نتیجے میں انہوں نے مجھے گھر کے ایڈوانس کے لئے رقم بھیج دی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا، اور متبادل فلیٹ میں بچوں کو منتقل کر دیا۔ اب میں کچھ مطمئین سا ہونے لگا تھا۔ بچے بھی دوبارہ زندگی کے خواب بننے لگے تھے۔ میں صبح 9 بجے اسکول پہنچتا، اور پھر گھر سے ہوتا ہوا اپہاڑ گنج میں عدیدؔ کے گھر چلا جاتا، جہاں ترجمے کا کام شروع کر دیا گیا تھا۔ اس طرح ایک مصروفیت مل گئی، اور میں ماضی کے حادثات سے بے گانہ ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ چند دنوں میں ترجمے کے کام میں میری ذمہ داری مکمل ہو گئی، اور اب مجھے صرف اسکول ہی کی مصروفیت میسر تھی۔

کورونا وائرس اور لاک ڈاؤن

لیکن ابھی ایک ماہ کی تنخواہ اٹھائی تھی کہ کرونا وائرس کے خطرے کے تحت عالمی سطح پر لاک ڈاؤن کا اعلان ہو گیا۔ اس پر اسکول انتظامیہ کی طرف سے چھٹی کا اعلان کر دیا گیا۔ اب پھر میں گھر پر پڑے رہنے کے لئے مجبور تھا۔ میں ہی کیا، پورے ملک میں یہی صورتحال پیدا ہو گئی۔ البتہ اس دوران مجھے اسکول کی طرف سے پانچ ہزار روپے ماہوار ملتے رہے، جس سے زندگی

کی رمق باقی رہی۔ اس کے علاوہ لاک ڈاؤن کے دوران چند ایک افراد اور اداروں کی طرف سے تھوڑا تھوڑا راشن بھی فراہم ہو گیا۔

لیکن مجھے جس مسئلے نے سب سے زیادہ پریشان کیا، وہ تھا فلیٹ کا کرایہ۔ میرا مینٹننس کا بل ہی تقریباً 6 ماہ سے رکا ہوا تھا۔ لاک ڈاؤن کے دوسرے ماہ بجلی اور گیس کا بل ملا کر کوئی آٹھ ہزار روپے بن گئے۔ اور اس کی ادائیگی میرے لئے ناممکن تھی۔ پانچ ہزار ماہوار میں خوراک، بچوں کا روزمرہ کا خرچ، فلیٹ کا کرایہ، اور بلوں کی ادائیگی سب ناممکن ہی تو تھا۔

آسمان کی ہولناک خاموشی

میں یہ سب کچھ سوچ سوچ کر مرا جا رہا تھا کہ آخر اپنے بچوں کو کہاں لے جاؤں۔ زندگی نے ایسے مقام پر لا کھڑا کیا تھا، جہاں کوئی امید باقی نہیں رہ گئی تھی۔ مجھے مذہب، خدا، انسان کی حقیقت، دنیا کا نظام سب کچھ ایک خیال و خواب محسوس ہو رہا تھا۔ مجھے زندگی سے نفرت ہونا شروع ہو گئی تھی۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ خودکشی کر لوں۔ لیکن بچوں کی فکر آتے ہی یہ خیال جھٹکنا پڑا۔ کیونکہ زندہ رہ کر تو میں ان کے لئے بھیک مانگ کر بھی کچھ نہ کچھ کر سکتا ہوں۔ لیکن میرے مرنے کے بعد ان کو کون پالے گا؟ کیا وہ خود ہاتھ پھیلائے لوگوں سے روٹی کے لئے بھیک مانگیں گے؟ یہ سوالات اٹھتے ہی میری روح میں ایک غیرت جاگ اٹھی۔ میں نے سوچا کہ کچھ ایسا کرنا ہو گا کہ بچوں کے مستقبل کے لئے کوئی نہ کوئی امید پیدا کر دی جائے۔ لیکن میرے راستے تو بند تھے۔ جس ماحول میں مجھے دھکیل دیا گیا تھا، بچے وہاں رہ نہیں پائیں گے۔ پھر کیا کروں؟ اے خدا! اگر تو موجود ہے، تو کوئی راستہ نکال۔ کوئی راستہ سُجھا۔

آسمان مسلسل خاموش تھا۔ کوئی سرگوشی بھی نہیں تھی۔ کوئی فرشتہ نہیں تھا، جو میرے کان میں یہ پھونک مارتا کہ "خوف نہ کھا۔ نہ گھبرا"۔ کوئی خدا نہیں تھا، جو کہتا کہ "میں یہواہ یری ہوں"۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ مجھ میں کوئی ایک اجنبی انسانیت پیدا ہو رہی ہے۔ یا شاید کوئی حقیقی انسانیت، جو سو رہی تھی، لیکن اب بیدار ہو رہی ہے۔ یہ الحاد تھا۔ یہ دہریت تھی۔ یہ مادیت تھی۔ یہ کفر تھا۔ آپ اسے کچھ بھی نام دیں۔ میرے خیال میں یہ "وجودِ الٰہی کا انکار" تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ دنیا کسی عاقل کی تخلیق نہیں۔ اس کا کوئی مقصد نہیں۔ یہاں کوئی نظام موجود نہیں۔ ہر طرف جہالت اور وحشت ہے۔ انسان کا وجود صرف ایک وہم و گمان ہے، جس کے آگے پیچھے کوئی حقیقت کارفرما نہیں۔ میں کئی دن خاموش رہا۔ کھسیانا رہا۔ بیوی بچوں سے تکلم اور گفتگو کم کر دی۔ پیسے ختم ہو چکے تھے۔ مالک مکان کم از کم ایک ماہ کے کرائے کا تقاضا کر رہا تھا۔ لیکن میں اس کا متحمل نہیں تھا۔ اگر ہوتا بھی تو بجلی گیس کا بل رہ جاتا۔

اس صورتحال میں مسائل سے نمٹنا تو مشکل تھا ہی، اوپر سے دن بدن بیوی کی زبان تلخ ہونے لگی، اور اس کے رویے میں بے ادبی اور تضحیک کا ظہور ہونے لگا۔ بچے بھی کچھ تند مزاج ہونے لگے۔ دراصل لاک ڈاؤن نے مجھے پہلے سے زیادہ مفلوج کر دیا تھا۔ کم از کم ہر اتوار کتابیں بیچ کر کچھ روپے لے آتا تھا۔ مگر اب بچوں کے لئے جیب خرچی فراہم کرنا بھی ناممکن ہو گیا تھا۔

بچوں سے لاتعلقی اور ملتان کی طرف سفر

انہی دنوں کسی دوست نے بتایا کہ پادری شفیق کنول نے پاکستان بائبل سوسائٹی پر مقدمہ دائر کرنے کی دھمکی دے دی ہے۔ بشپ ریاض شریف اور بنجمن پاسکل عدید کے ساتھ اس موضوع پر گفتگو ہوئی۔ بنجمن نے ایک ویڈیو جاری کرنے کے لئے مجھے شرکت کی دعوت دے دی۔ میں نے بیوی سے کہا کہ مجھے پہاڑ گنج جانا ہے۔ وہ بھی تیار ہو گئی۔ اس طرح بچے اپنے ننھیال چلے گئے، جہاں انہیں مزید دو دن رکنے کے لئے کہا گیا۔ میں بنجمن سے مل کر واپس آ گیا۔

اب میں اس کرائے کے فلیٹ میں اکیلا تھا۔ گذشتہ دنوں بلکہ مہ و سال کی ساری تاریخ میرے ذہن میں گھومنے لگی۔ اس میں کوئی دن ایسا نہیں تھا، جسے میں گرفت میں لے کر مزید آگے بڑھنے سے روک سکتا۔ سب کچھ بڑی تیزی سے گزرتا جا رہا تھا۔ کوئی ایک لمحہ بھی ایسا نہیں تھا، جسے میں ہاتھ کی مٹھی میں قید کر کے واپسی کی طرف پھینک دیتا۔ میں نے خود کو بے بس و لاچار پایا۔

ایک بے چینی تھی، جس نے مجھے دو راتیں ٹھیک سے سونے نہیں دیا۔ رات کو کئی کئی بار آنکھ کھل جاتی۔ پھر وہی خیالات، جو پہلی نیند کی جھپکی سے قبل ذہن میں ابھرے، بار بار آتے۔ آخر کار فلیٹ کو تالا لگا کر بھاگ جانے کا خیال آیا۔ سوچا کدھر جاؤں؟ ہر طرف لاک ڈاؤن ہے۔ کوئی ایسا عزیز کراچی میں نہیں، جس کے ہاں پناہ مل سکے۔ پھر خیال آیا کہ شہر سے دور نکلوں۔ کورونا وائرس کی زد میں آ جاؤں گا، تو موت کی وادی میں چلا جاؤں گا۔ ہر شئے بلکہ ہر دکھ سے نجات مل جائے گی۔ کچھ اَور نہیں تو کم از کم مجھے ایک مریض سمجھ کر میرے بچوں کا کچھ خیال کر لیا جائے گا۔

یہ خیال آتے ہی فوراً چند کتابیں اٹھائیں، اپنے کپڑے ایک تھیلے میں ڈالے، اور صبح کا انتظار کرنے لگا۔ ابھی رات اتنی بھی نہیں گزری تھی کہ ایک ٹیلی فون آ گیا۔ یہ جناب خالد محمود صاحب تھے، جو اپنی جوانی میں مسیحی سے مسلمان ہو چکے تھے۔ میں نیند میں تھا۔ لیکن جب انہوں نے اپنا تعارف کروایا تو نیند اڑ گئی۔ انہوں نے کہا کہ ان کو ایک کتاب بنام "معتدبہ کتابِ مقدس" چاہئے، جس کے لئے وہ مجھے ایک ہزار نہیں بلکہ پندرہ سو روپے بھیج رہے ہیں۔ کال ختم ہوئی تو وقت دیکھنے کا موقع ملا۔ رات کے کوئی دو بج رہے تھے۔ صبح انہوں نے پھر کال کر دی اور بتایا کہ کتاب ان کو مل چکی ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی وہ

مجھے ایک ہزار روپیہ بھیج رہے ہیں۔ اس کے چند منٹوں بعد ہی مجھے ہزار روپے کا ایس ایم ایس موصول ہو گیا۔ میں نے فوراً جا کر پیسے نکلوائے۔ موٹر سائیکل کی ٹیوننگ کا کام کروایا، اور اپنے اسکول کی انتظامیہ سے تنخواہ کے بارے معلوم کیا۔ انہوں نے بتایا کہ تنخواہ اس ماہ کے بالکل آخر میں ملے گی۔ میں نے عرض کی کہ میری حالت بہت دگرگوں ہے۔ اس پر ایک ذمہ دار نے مجھے دو ہزار روپے ایزی پیسہ کر دیئے۔ ان پیسوں سے میرے مسائل تو حل نہیں ہو سکتے تھے۔ البتہ مجھے یہ خیال ضرور آیا کہ میں شہر سے نکلنے کی کوشش کر سکتا ہوں۔ لہٰذا میں نے اگلے دن صبح سویرے کراچی سے نکلنے کا پروگرام بنالیا۔

میں نے احتیاطاً اپنے ملتان والے دوست بھائی ابو ہشام کو کال کر دی کہ میں ان کے پاس آرہا ہوں۔ لہٰذا میں نے صبح 5 بجے موٹر سائیکل نکالی اور سپر ہائی وے پر چڑھ گیا۔ میرا رخ حیدر آباد کی طرف تھا، اور گیارہ بجے میں حیدر آباد سٹی میں تھا۔ یہاں پر میں نے ایزی پیسہ کی دکان تلاش کی اور اسکول انتظامیہ کے ایک فرد کی طرف سے آنے والے دو ہزار روپے نکلوائے، اور آگے کی طرف سفر شروع کر دیا۔

سفر کی پہلی رات اور یسوع سے ملاقات

مجھے حیرت ہوئی کہ کراچی سے حیدر آباد تک راستے میں کوئی سیکیورٹی نہ تھی۔ کورونا وائرس کے حوالے سے جو سختی اندرونِ شہر تھی، وہ سپر ہائی وے پر نہیں تھی۔ موٹر سائیکل پر ڈبل سواری بھی دیکھی، اور ماسک کی عدمِ پابندی کا بھی مظاہرہ دیکھا۔ اس طرح میرا سفر بھی ایک بے خطر سفر بن گیا۔ اگرچہ میں کراچی کی حدود سے دور نکل آیا تھا۔ لیکن میرا ذہن مسلسل کراچی میں گھوم رہا تھا۔ خصوصاً اپنے بیوی بچوں کے ارد گرد۔ پھر بھی میں موٹر سائیکل کو اڑائے جا رہا تھا۔

رات کوئی 8 بجے کا وقت ہو رہا تھا کہ میں دولت پور کے ایک ہوٹل پر رک گیا۔ یہاں بڑے بڑے تختے بچھے ہوئے تھے۔ میں نے موٹر سائیکل ایک طرف کھڑی کر کے لاک لگا دیا، اور ایک خالی تختے پر جا کر بیٹھ گیا۔ کھانے کا آرڈر دے کر کچھ دیر لیٹا ہی تھا کہ کھانا آ گیا۔ کھانا کھایا اور چائے کا آرڈر دے دیا۔ اس طرح نیند کو خود پر طاری کرنے کا سامان کر لیا۔ کیونکہ تھکاوٹ بہت زیادہ ہو گئی تھی۔ لیکن رات کے کسی پہر (مجھے اب صحیح وقت یاد نہیں)، مجھے ایسا محسوس ہوا کہ کوئی مجھ کو پکار رہا ہے۔

"جَون!(John!)"

میں چونک پڑا۔ نیند کے عالم ہی میں آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھا۔ ہوٹل میں سناٹا تھا۔ سارے تختے خالی پڑے ہوئے تھے، اور میرے علاوہ کوئی موجود نہ تھا۔ ہوٹل سے کچھ دور سڑک پر طویل طویل وقفوں کے بعد کوئی ٹرک گزر جاتا تھا،

جس کی آواز ماحول کو مزید دہشت ناک بنا دیتی تھی۔ میں نے خوف و دہشت کے مارے آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن کچھ دیر بعد پھر وہی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"جَون!(John!)"

اب تو میرے حواس گم ہو گئے، اور نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے ہمت کر کے آنکھیں کھول دیں۔ پھر چاروں طرف دیکھا۔ لیکن اپنے سوا کسی کو نہ پایا۔ آخر میں نے زور سے پکار کر پوچھا؛

"کون ہے؟"

آواز آئی؛

"میں ہوں"

میں نے کہا؛

"کون؟"

کہا؛

"یسوع"

صبح ہوئی اور آنکھ کھلی۔ ہوٹل میں بڑی گہما گہمی تھی۔ چند ایک تختوں کے علاوہ سب تختوں پر لوگ بیٹھے ناشتے کے مزے لے رہے تھے۔ میں نے ویٹر کو بلایا، اور ناشتے کے لئے آرڈر دے دیا۔ ویٹر نے مجھ سے سوال کیا کہ "سر آپ کہاں سے آ رہے ہیں؟ میں نے کہا کراچی سے۔ اس پر اس نے کہا کہ اسی لئے آپ بہت تھکے ہوئے تھے"۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا تم رات کو ہوٹل بند کر دیتے ہو؟ اس نے بتایا کہ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ ہمارا ہوٹل تو 24 گھنٹے کھلا رہتا ہے، اور یہاں ہر وقت ڈرائیور آتے جاتے اور کھانا چائے کھاتے پیتے رہتے ہیں۔ یہ سن کر میں خاموش ہو گیا، اور ناشتے کے لئے منہ ہاتھ دھونے چلا گیا۔

سفر کی دوسری رات اور یسوع سے ملاقات

دولت پور سے آگے کے سفر کے دوران میرے ذہن میں کراچی کے مسائل نے اتنا سر نہیں اٹھایا، جتنا کہ رات والے خواب اور اس کے مکالمے نے۔ لہٰذا میں آگے کے تمام سفر میں اسی بارے غور و خوض کرتا رہا۔ میرا اگلا پڑاؤ جلال پور سے بہت پہلے ایک ہوٹل پر تھا۔ یہ ہوٹل ایک پیٹرول پمپ کے برابر میں سڑک سے بہت زیادہ ہٹ کر تھا۔ ہوٹل اور پمپ کے درمیان

ٹرکوں کے لئے اسٹیشن بنایا گیا تھا۔ اور پمپ اور ہوٹل کے دونوں طرف دور دور تک آبادی کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ رات کا اندھیرا تو بڑھ رہا تھا، لیکن مجھ میں مزید آگے بڑھنے کی سکت نہیں تھی۔ لہٰذا میں نے اسی ہوٹل پر شب بسری کا فیصلہ کر لیا۔ یہاں چار پانچ چارپائیاں تھیں، جن پر دو تین افراد براجمان تھے۔ باقی ہوٹل ویران و سنسان تھا۔

میں نے موٹر سائیکل ایک طرف کھڑی کی، لاک لگایا، اور ایک چارپائی پر لیٹ گیا۔ کمر سیدھی کی تو ویٹر کو آواز دی۔ اسے کھانے اور چائے کا آرڈر دیا، اور خود ہاتھ دھونے چلا گیا۔ ابھی میں واپس آکر چارپائی پر بیٹھا ہی تھا کہ دو تین موٹر سائیکل سوار اَور آ گئے۔ ان کے پاس کھیس اور چادریں تھیں۔ یعنی یہ لوگ ان چیزوں کی فروخت کا کام کرتے تھے۔ دو افراد میرے برابر والی چارپائی پر آکر بیٹھ گئے۔ علیک سلیک کے بعد ایک نے مجھ سے پوچھا کہ کیا یہاں رات گزارنے کی اجازت مل سکتی ہے؟ میں نے اسے بتایا کہ مجھے معلوم نہیں۔ کیونکہ میں تو خود مسافر ہوں۔ اس پر اس نے ہوٹل والوں سے پوچھا۔ ہوٹل والوں نے بِلا تعامل اجازت دے دی۔ لیکن انہوں نے بتایا کہ ہم آپ کو سونے کی اجازت تو دے سکتے ہیں، لیکن اپنی موٹر سائیکلوں اور سامان کی حفاظت آپ کی اپنی ذمہ داری ہے۔ شاید یہاں ایسا کوئی واقعہ ہو چکا تھا جس کی بنا پر ہوٹل والوں نے اس طرح صاف صاف بتا دیا۔ خیر میں تو کشتیاں جلا کر نکلا تھا۔ مجھے پرواہ نہیں تھی، خواہ کیسا ہی واقعہ کیوں نہ ہو جائے۔

کھانا آیا۔ کھایا گیا، اور میں سو گیا۔ رات کے کسی پہر (مجھے وقت یاد نہیں) پھر وہی خواب اور مکالمہ وقوع میں آیا۔ صبح جاگا تو سب کچھ نارمل تھا۔ اب میں نے اس خواب کو ابلیس سے منسوب کیا، اور یہ کہہ کر اپنے آپ کو تسلی دینے لگا کہ شاید ابلیس مجھے واپس کراچی میں لے جانے کے بہانے تراش رہا ہے۔ تاکہ میں یسوع کی محبت بھری شخصیت اور تعلیم سے متاثر ہو کر واپس دکھوں اور تکلیفوں میں زندگی گزارنے پر راضی ہو جاؤں۔ لہٰذا اس خیال کے آتے ہی میں نے اس خواب اور مکالمے کو کوئی اہمیت نہ دینے کا تہیہ کر لیا۔ اس کے بعد آگے کا سفر شروع کر دیا۔ اب میں ملتان کے قریب پہنچتا جا رہا تھا، لہٰذا میں من ہی من میں وہاں کے ملاقاتیوں سے مکالمہ کرنے کی تیاری کرنے لگا۔ لیکن اس دوران کبھی کبھی مجھے رات والے خواب اور مکالمے کا بھی خیال آ جاتا تھا۔

چند گھنٹوں کی مسافت کے بعد موٹر سائیکل کی آواز میں تبدیلی آ گئی۔ میں نے جھک کر جائزہ لینا شروع کیا تو انجن کی حدت کو محسوس کیا۔ کچھ دور موٹر سائیکل مکینک نظر آیا۔ موٹر سائیکل روکی، اور اسے آئل تبدیل کرنے کا کہہ دیا۔ پندرہ بیس منٹوں میں یہ مسئلہ حل ہو گیا، اور میں نے مزید سفر کے لئے کمر باندھ لی۔ لیکن موٹر سائیکل کی آواز متواتر تبدیل ہو رہی تھی۔ بلکہ اب تو اس کے چلنے میں ہلکے ہلکے جھٹکے بھی محسوس ہونے لگے تھے۔ آگے پھر ایک مکینک آیا، اور میں اس کے پاس رک گیا۔ مسئلہ بتایا تو اس نے کاربوریٹر تبدیل کرنے کا مشورہ دیا۔ میں نے بٹوا کھولا، تو چند سو روپے سے زیادہ کچھ نہ پایا، جس کا مطلب یہ تھا کہ آگے کا سفر اسی طرح کرنا پڑے گا۔ لہٰذا اب موٹر سائیکل کی رفتار اتنی ہی رکھنا مناسب تھی، جتنا کہ وہ خود برداشت کر سکے۔

یسوع سے تیسری ملاقات

جلال پور روڈ پر ایک بہت ہی عجیب سڑک آئی، جس کے دونوں طرف کوئی آبادی نہ تھی۔ بلکہ غیر فصلی اور خالی زمین تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ یہاں کی زمین ناقابلِ کاشت تھی۔ کچھ دور ایک چھوٹی سی نہر کا پُل نظر آیا۔ وہاں پُل کے برابر میں ایک چھپرا تھا، اور اس کے نیچے چند افراد جمع تھے۔ چھپرے کے برابر میں ایک چھوٹا سا مکان بنا ہوا تھا، جہاں مچھلیاں رکھی ہوئی تھیں۔ گویا کہ یہاں مچھلیوں کا کاروبار کیا جارہا تھا۔ میں یہاں رکا اور چارپائی پر لیٹ گیا۔ مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ میں کب سو گیا۔ البتہ جب آنکھ کھلی تو وہاں دو تین لڑکے برابر والی چارپائی پر لیٹے کوئی ویڈیو فلم یا گانا دیکھ رہے تھے۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی۔ مگر نہ اٹھ سکا۔ پھر آنکھیں بند کر لیں۔

معلوم نہیں کہ یہ خواب تھا یا حقیقت۔ ایک شخص وہاں آیا، اور تاکیدی انداز میں مخاطب ہوا؛

"جال ڈالو، اور مچھلیاں پکڑو"

"جلدی کرو۔ جال پھینکو"

یہ سنتے ہی میری آنکھ کھل گئی یا مجھے ہوش آگئی۔ میں نے دیکھا کہ لڑکے متواتر موبائل پر نظریں گاڑے ویڈیو دیکھنے میں منہمک ہیں۔ میں نے اٹھ کر ان سے پوچھا کہ وقت کیا ہوا ہے؟ ان میں سے ایک بولا 12 بجنے والے ہیں۔ میں نے پوچھا میں کتنی دیر سویا ہوں۔ وہ بولے ہمیں اندازہ نہیں۔ کیونکہ ہم خود ویڈیو دیکھنے میں مصروف تھے۔ میں نے یہ سنتے ہی ان سے ایک اَور سوال کر دیا؛ "یار باباجی آپ کو مچھلیاں پکڑنے کا کہہ گئے ہیں، اور آپ فلم دیکھنے میں مصروف ہو"۔ اس پر ان کے چہروں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور ایک بولا؛ "انکل لگتا ہے کہ آپ بہت تھکے ہوئے ہیں۔ آپ مزید آرام کر لیں"۔ میں نے پوچھا "کیا مطلب؟ کیا آپ کو کسی نے مچھلیاں پکڑنے کے لئے نہیں کہا؟" ان میں سے ایک بولا؛ "نہیں۔ کیونکہ یہاں ہمارے علاوہ کوئی اور ہے ہی نہیں"۔ اس پر میں سمجھ گیا کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے، اور یہ خطاب مجھ ہی سے کیا گیا ہے۔

ملتان میں قیام کے روز و شب

جلال پور سے شجاع آباد تک سڑک بہت خراب تھی، اور اس پہ ستم یہ کہ میری موٹر سائیکل بھی تھک چکی تھی۔ لہٰذا میں ملتان شہر میں شام 5 بجے تک پہنچ پایا۔ مطلوبہ مقام پہلے سے دیکھا ہوا تھا۔ لہٰذا سیدھا ہشام بھائی کے گھر کے دروازے کے

پاس پہنچ کر بریک لگائی۔ دروازہ کھٹکھٹایا، اور ہشام بھائی کو آواز دی۔ تیسری آواز پر دروازہ کھلا، اور ہشام بھائی مجھے دیکھ کر خوش ہو گئے۔

چونکہ اس سارے سفر کے دوران میرا موبائل فون بند رہا تھا، اس لئے ہشام بھائی خفا بھی ہوئے۔ اس خفگی کی وجہ بھی جائز تھی۔ کیونکہ لاک ڈاؤن کو لے کر ان کے دل میں عجیب و غریب وسوسے پیدا ہونے لگے تھے۔ بہر حال انہوں نے مجھے ضروری لوازمات پیش کرنے کے بعد آرام کی مشورت دی۔ میرے لئے بھی یہی ضروری امر تھا۔ لہٰذا میں سو گیا۔

آدھی رات کو آنکھ کھلی، تو پیٹ میں گڑبڑ محسوس ہوئی۔ یا کہہ لیں کہ پیٹ کی گڑبڑ نے مجھے نیند سے جگا دیا۔ دراصل راستے کی شدید گرمی، اور کھانا مناسب طریقے سے ہضم نہ ہو سکنے کی وجہ سے میرا پیٹ خراب ہو گیا تھا۔ پانچ دن تک یہی صورتحال رہی۔ کھانے پینے میں احتیاط کرنا پڑا، اور ایک عجیب سی غنودگی کے عالم میں پانچ دن گزر گئے۔ بالآخر چھٹے دن پیٹ کے عارضے سے جان چھوٹی اور ذہن و بدن نے خوراک کا تقاضا کیا۔ ہشام بھائی ایک زندہ دل آدمی ہیں۔ ان کے ہاتھ خواہ خالی ہوں، لیکن وہ اپنے رویے میں کسی طرح کی تلخی نہیں لاتے۔ انہوں نے ان ابتدائی پانچ دنوں میں مجھے موزوں مشروبات بنا بنا کر پلائے۔ کھانے میں مصالحے دار اور سخت خوراک سے باز رکھا۔ فروٹ میں تربوز اور خربوزہ کھلایا۔ حالانکہ یہ ماہِ رمضان تھا، لیکن انہوں نے میرے لئے کوئی نعمت نہیں روکی، اور خود روزے کی حالت میں ہونے کے باوجود فروٹ کاٹ کر دیتے رہے۔

ملتان میں تین چیزوں پر ایک محاورہ ترتیب دیا گیا ہے کہ "ملتان میں تین چیزوں کی کثرت ہے؛ گرمی، گرد اور گورستان"۔ میں نے اس محاورے کا مشاہدہ کیا، تو اسے درست پایا۔ تاریخی شہر ہونے کے باعث یہاں قبرستان بہت ہیں۔ جغرافیائی لحاظ سے یہاں گرمی اور گرد و غبار بھی بہت زیادہ ہے۔ ہر شہر کی کوئی نہ خوبی ہے، اور اس خوبی کی بنا پر اس شہر کے ساتھ کچھ محاورے منسوب کئے گئے ہیں۔

اے ربی! تو کیا چاہتا ہے؟

رمضان کے روزے ختم ہو چکے تھے۔ عید الفطر بھی آئی، اور چلی گئی۔ جتنا ہو سکا ابو ہشام نے میری مہمان نوازی کے زمرے میں کیا۔ لیکن عید کے دو دن بعد کے حالات نے ایک اور شکل اختیار کر لی۔ میرے پاس دو ڈھائی سو روپے جو بچ رہے تھے، وہ بھی ختم ہو گئے، اور خود ہشام بھائی کا ہاتھ بھی تنگ ہو گیا۔ ان کے ہاتھ تنگ ہونے کی وجہ تو واضح تھی کہ عید گزری تھی۔ لیکن میرا ہاتھ خالی ہوا، اس بات کے لئے میں خود ذمہ دار تھا۔

مجھے مسلسل چھ دن اس صورتحال کا سامنا کرنا پڑا۔ میں نسوار رکھنے کا عادی تھا۔ اس کی ضرورت محسوس ہوتی تو دماغ ماؤف ہونا شروع ہو جاتا۔ ہشام بھائی سے نسوار کے لئے پندرہ روپے مانگے، تو وہ شرمندہ ہو گئے۔ آخر میں باہر نکلا اور ایک دو دکانوں پر ادھار کی کوشش کی۔ ایک دکان سے نسوار مل گئی۔ طبیعت میں سکون آ گیا۔ لیکن اس کے ختم ہو جانے پر کیا ہو گا؟ یہ سوال آتے ہی لاہور میں ایک دوست کو فون کیا۔ اسے بتایا تو وہ خاموش ہو گیا۔ میں اس کی خاموشی کا مطلب سمجھ سکتا تھا۔ دراصل اس کی خاموشی مجھ سے شکایت کر رہی تھی کہ میں کیوں لاک ڈاؤن کے دوران بیوی بچوں کو چھوڑ کر گھر سے اتنی دور نکل آیا ہوں۔ میں نے اسے دوبارہ کہا کہ پانچ سو روپے ہی بھیج دو۔ اس نے کہا کہ کچھ کرتا ہوں۔ لیکن اس نے پیسے نہیں بھیجے۔ حالانکہ یہی دوست لاک ڈاؤن سے قبل میری اچھی خاصی مدد کر چکا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ مجھے کچھ سکھانا چاہ رہا ہے۔

یہ دن پیسوں کی ضرورت کے تھے۔ ابو ہشام بھی اس مسئلے پر نالاں دکھائی دے رہا تھا۔ آخر ہم نے نواب پور کی طرف جانے کا سوچا، جہاں ابو ہشام کے ایک جاننے والے ڈاکٹر صاحب مقیم تھے۔ وہاں پہنچے۔ مدعا بیان کیا۔ انہوں نے تین ہزار روپے عنایت کر دیئے۔ واپسی پر رات ہو رہی تھی۔ رات ابھی پہنچے ہی تھے کہ زبردست بادل چھا گئے اور موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ آج کی رات بیٹھک میں سونا پڑا۔ رات کا کون سا پہر تھا، مجھے معلوم نہیں کہ ایک آواز نے مجھے چونکا دیا؛

"جَون!(John!)"

میں فوراً جاگ گیا۔ دیکھا کہ بیٹھک میں میرے علاوہ کوئی نہیں۔ بڑی گلی کی طرف کھلنے والا جالی دار دروازہ بند تھا۔ لیکن اس جالی دار دروازہ سے ایک تیز اور چمکدار روشنی آ رہی تھی۔ البتہ بارش تھم چکی تھی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہشام بھائی چھت پر سونے کے لئے چلے گئے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ شاید اچھا خاصا دن نکل آیا ہے۔ لیکن اچھے خاصے دن میں اتنا ہیبت ناک سناٹا نہیں ہوتا۔ کم از کم پرندوں کی آوازیں تو ضرور ہی آ جاتی ہیں۔ میں نے اپنے سرہانے کی طرف دیوار پر آویزاں لٹکے ہوئے وال کلاک کو دیکھا۔ جہاں تک میری یادداشت ساتھ دے رہی ہے، تو رات کے دو بج رہے تھے۔ میں حیران ہوا کہ رات کے اس وقت باہر اتنی روشنی نہیں ہو سکتی جتنی کہ جالی دار دروازے سے چھن کر آ رہی تھی۔ اگر یہ بادل گرجنے کی روشنی ہے تو پھر یہ مستقل نہیں ہو سکتی۔ کیوں کہ بارش نام کی کوئی شئے اب موجود نہ تھی۔ مجھے اچھی طرح معلوم نہیں کہ یہ خواب تھا یا حقیقت۔ بہر حال جو کچھ بیان کیا ہے، یہی صورتحال تھی۔ آواز پھر آئی؛

"جَون!(John!)"

اب تو میں نے پوری طرح آنکھیں کھول کر مشاہدہ کرنے کی کوشش کی۔ کیونکہ مجھے یہ احساسِ تحفظ بھی حاصل تھا کہ میں ایک گھر میں بیٹھا ہوا ہوں، اور کسی طرح کے خطرے کا کوئی اندیشہ نہیں ہو سکتا تھا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

میرے رونے کی نوبت آ گئی تھی۔

میں نے ایک رقت آمیز دبی ہوئی آواز میں پوچھا کہ "کون ہے؟"

آواز آئی؛"میں ہوں، یسوع"۔

یہ سن کر میرا جسم کپکپانے لگ گیا، اور میرے حلق سے صرف ایک دبی ہوئی آہ نکل سکی۔ اس نے پھر پکارا؛

"جَون! ڈرو مت۔ میں ہوں"۔

اس پر میں صرف اتنا ہی کہہ پایا کہ "اے ربی!"

"بھاگ رہے ہو؟" یسوع نے پوچھا۔

"اے ربی! اب مزید برداشت نہیں کر سکتا۔ سب کچھ چھوڑ کر ایک نئی زندگی کی طرف جا رہا ہوں"۔

"کیا تم نہیں جانتے کہ راستبازی کے سبب سے ستایا جانا تمہارے لئے مبارک ہے؟

آسمان کی بادشاہی اسی کا نام ہے۔

خوشی اور شادمانی کرو۔ کیونکہ تمہارا اجر بڑا ہے"۔

"لیکن ربی! میں تو بچپن سے دکھ سہتا آ رہا ہوں۔ اب تو مجھے آرام ملنا چاہئے"۔

"زمین پر آرام تلاش مت کرو۔ یہ عمل ان کا ہے، جو صرف دنیا ہی کو سب کچھ سمجھ بیٹھے ہیں۔

"لیکن ربی! اب مجھ میں ہمت نہیں رہی۔ پھر کم از کم مجھے انصاف تو ملنا چاہئے"۔

"جَون! اگر نمک کا مزہ ختم ہو جائے تو وہ کسی کام کا نہیں رہتا۔

اپنی فطرت پر قائم رہو۔

جو تمہیں ستاتے ہیں، انہیں معاف کر دو۔

دشمنوں سے محبت اور ستانے والوں کے لئے دعا کرو۔

ہمارا آسمانی باپ اپنا سورج نیکوں اور بدوں دونوں پر چمکاتا ہے، اور دونوں ہی پر مینہ برساتا ہے؟

اگر تم آدمیوں کے قصور معاف کرو گے تو تمہارا آسمانی باپ بھی تمہارے قصور معاف کرے گا"۔

"اے ربی! انہوں نے میرا سب کچھ چھین لیا ہے۔ میرے بچے بے گھر ہو چکے ہیں۔ سارے وسائل کھو گئے ہیں۔ میرے لئے انصاف ہونا چاہئے"۔

"کیا جان خوراک سے اور بدن پوشاک سے بڑھ کر نہیں؟

ہوا کے پرندے نہ بوتے ہیں، نہ کاٹتے ہیں۔ پھر بھی آسمانی باپ ان کو کھلاتا ہے۔

تمہاری قدر تو ان سے زیادہ ہے۔

کیا تم فکر کر کے اپنی عمر کی ایک بھی گھڑی بڑھا سکتے ہو؟

فکر مت کرو۔

آسمانی باپ جانتا ہے کہ تم کو کن چیزوں کی ضرورت ہے۔
سب سے پہلے آسمانی باپ کی بادشاہی اور راست بازی کی تلاش کرو۔
جب تم اپنے بچوں کے لئے اچھی چیزوں کی فکر کر رہے ہو، تو کیا آسمانی باپ کو فکر نہیں؟
یہ تنگ دروازہ ہے۔ مگر تمہیں اسی سے ہو کر آسمان کی بادشاہی میں داخل ہونا ضرور ہے۔
کھلا اور آسان راستہ زندگی اور آسمان کی بادشاہی کا راستہ نہیں۔ اس کی خواہش نہ کرو۔
اگر تم اچھے درخت ہو، تو تم کو اچھا پھل لانا ضرور ہے۔
کیا جھاڑیوں سے انگور یا اونٹ کٹاروں سے انجیر حاصل کیا جاسکتا ہے؟
اچھا درخت ہمیشہ اچھا پھل اور برا درخت ہمیشہ برا پھل دیتا ہے۔ اس کو سمجھو۔
لہٰذا اپنی فطرت سے تجاوز نہ کرو۔ واپس پلٹو۔ اپنی فطرت سے اچھے پھل پیدا کرو"۔
"لیکن ربی! سینکڑوں لوگ تیرے نام سے دنیا کی آسایشوں کا مزہ بھی لے رہے ہیں۔ پھر میرے ساتھ ہی یہ ناانصافی کیوں؟"
"انہیں چھوڑ دو۔ وہ اندھی راہ دکھانے والے ہیں۔
بہتیرے ایسے ہیں، جو میرے نام سے نبوت کر رہے ہیں اور بدروحوں کو نکال رہے ہیں۔ بلکہ بڑے بڑے معجزے کر رہے ہیں۔
لیکن میری ان سے واقفیت نہیں۔
تمہارے لئے ضروری ہے کہ تم میری مانند بنو۔ کیا میں نے دنیا میں کچھ جمع کیا؟ گھر بنایا؟ آسایشوں کی تمنا کی؟
بلکہ میں نے تو اپنی جان تک کا دکھ اٹھایا ہے۔ اگر تم میرے شاگرد ہو، تو پھر تمہارے لئے یہی کافی ہے کہ میری مانند بنو"۔
"ربی! مجھ پر مسلمان ہو جانے کا جھوٹا الزام لگا کر مجھے مشکوک بنا دیا گیا ہے۔ اب میرے لئے واپسی ناممکن ہے"۔
جب انہوں نے مجھے بعلزبول کہا تو تم کو کیا کچھ نہ کہیں گے؟"
"ربی! کیا میں زندگی کے مزید 30 سال عوام کو اپنے اخلاص کا یقین دلانے میں ضائع کروں؟"
"جَون! میں تم کو لوگوں کے لئے نہیں کہتا۔ میں تو تم کو اپنے لئے بلاتا ہوں۔
وہ جو کچھ کرتے ہیں، اس میں ایسا کچھ نہیں، جو پوشیدہ رہے گا اور کھولا نہ جائے گا"۔
"اے ربی! لیکن اب تو وہ میری جان کے دشمن بنے ہوئے ہیں، اور مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں"۔
"وہ صرف بدن کو قتل کر سکتے ہیں، روح کو نہیں۔ لیکن خدا ان دونوں چیزوں کو ختم کر سکتا ہے۔
تو پھر تمہیں ان کی نسبت خدا سے ڈرنا زیادہ واجب ہے۔
فضا میں اڑنے والی ایک چڑیا بھی تمہارے آسمانی باپ کی مرضی کے خلاف زمین پر نہیں گر سکتی۔
جبکہ تمہاری قدر اس سے زیادہ ہے۔ پھر کیوں بے اعتقاد ہوتے ہو؟

آدمیوں کے سامنے میرا اقرار کرو، اور اپنی صلیب اٹھا کر میرے پیچھے آؤ۔
میرا جوا اٹھالو۔ مجھ سے سیکھو۔
میں حلیم اور فروتن رہا ہوں۔ میری پیروی کرو"۔
"ربی! کیا میں مسلمانوں کو دھوکا دوں؟ انہوں نے مجھے سہارا دیا، اور میری مشکل میں مدد گار بنے۔ مناسب نہیں کہ ان سے یوں بے وفائی کروں"۔
"جَون! یہ ایک اچھی بات ہے۔ میں بھی تمہیں اس اصول سے انحراف کی اجازت نہیں دے سکتا۔
لیکن تمہیں میرے لئے کام کرنا ہے۔ کسی کلیسیا یا کسی مذہبی ادارے کے لئے نہیں۔
میری تعلیم کی روح کو سمجھ لو۔ یہ ہر مذہب کی روح ہے۔ بس اسی کا پیغام عام کرو۔ خواہ مسلم رہ کر خواہ مسیحی رہ کر۔
تم میرے ہو۔ میں نے اپنے آسمانی باپ سے تمہیں مانگ لیا ہے۔
تمہیں میری "محبت کی شریعت" پر عمل کرنا ہے، اور اسی کا پرچار کرنا ہے"۔

(مکالمہ بہت طویل تھا۔ اسے یہاں لکھنا قاری پر بوجھ ڈالنے کے مترادف ہو گا۔ اس لئے میں نے صرف ابتدائی اور ضروری باتیں مختصراً لکھ دی ہیں)۔

کراچی واپسی کا منصوبہ

میں صبح دیر تک سویا رہا۔ جب جاگا تو ابھی ہشام بھائی چھت سے آئے نہیں تھے۔ مجھے حاجت محسوس ہو رہی تھی۔ واش روم گیا تو نہا لینے کا بھی خیال آ گیا۔ تازہ دم ہو کر باہر نکلا تو جالی دار دروازے کی طرف بڑھا۔ باہر سورج کی روشنی اور دھوپ چمک رہی تھی۔ پرندوں کی آوازیں آ رہی تھیں، اور آس پڑوس سے معمول کے مطابق ہنگامِ زندگی کے آثار محسوس ہو رہے تھے۔ دروازہ کھولا اور گلی میں کھڑا ہو گیا۔ دونوں طرف نظر دوڑائی، اور پھر واپس بیٹھک میں آ گیا۔
اتنی دیر میں ہشام بھائی بھی چھت سے اتر آئے۔ علیک سلیک کے بعد انہوں نے بتایا کہ رات کو بارش تھمتے ہی وہ چھت پر چلے گئے تھے۔ مجھے اس لئے نہیں لے گئے کیونکہ میں گہری نیند میں سو رہا تھا۔ پھر وہ بھی نہانے دھونے میں مصروف ہو گئے، اور میں رات والے واقعے پر سوچنے لگا۔

میں مسلسل خاموش تھا۔ ہشام بھائی فراغت پا کر آئے تو معمول کے مطابق گفتگو کا آغاز ہو گیا۔ لیکن مجھے ذہنی طور پر مکمل حاضر نہ پاتے ہوئے سوال کیا کہ "کیا بات ہے، کچھ پریشان ہو؟"

میں نے عرض کیا، "کچھ خیالات ذہن میں امڈ رہے ہیں۔ سوچ رہا ہوں ان کو لکھنا شروع کر دوں"۔

وہ خوش ہو گئے، اور کہا کہ "ضرور لکھنا چاہئے۔ لیکن زیادہ بہتر ہے کہ اب اپنے اسلام قبول کرنے کی گواہی بھی لکھ دو"۔

میں نے کہا، "جی ہاں! گواہی لکھنے کا ہی خیال ہے"۔

زندگی کا حقیقی مقصد

انسان کو خدا نے اپنی صورت پر پیدا کیا ہے۔ لیکن یہ صورت ظاہری مشابہت کی نہیں۔ بلکہ عقلی مشابہت کی ہے۔ انسان نے اپنی عقل کو اس جہان کے خدا کے ہاتھ میں دے کر اس صورت کو مسخ کر لیا ہے، اور اپنے مقام سے نیچے آ گیا ہے۔ خدا چاہتا ہے کہ انسان اپنا سابقہ مقام دوبارہ حاصل کرے۔ اس نے بہت سے انبیاء کے ذریعے انسان کو ہدایت و انتباہ پہنچائی۔ لیکن انسان اپنی بحالی میں مسلسل ناکام رہا۔ پھر خدا نے یسوع کو بھیجا، جس نے نوعِ انسانی کی باطنی اصلاح کے لئے اپنی زندگی سے مثال پیش کی، اور انسان کو دکھایا کہ کس طرح خدا کی تابع فرمانی کرنا چاہئے۔

یسوع اگرچہ موسوی شریعت کو منسوخ کرنے نہیں آیا تھا۔ لیکن اس نے انسانوں کو یہ عندیہ دیا کہ وہ خواہ کسی بھی شریعت کے اختیار کے تحت رہیں، لیکن اس کی تعمیل میں دیانت دار ہو جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے فقیہوں اور فریسیوں کو سرزنش کی کہ؛ "تم سونف اور زیرے پر تو دہ یکی دیتے ہو۔ لیکن اونٹ کو نگل جاتے ہو۔ اچھا ہوتا کہ وہ بھی کرتے اور اسے بھی نہ چھوڑتے"۔ اس سرزنش سے معلوم ہوتا ہے کہ یسوع موسوی شریعت کی جگہ ان کو کوئی نئی وضعی شریعت نہیں دے رہا تھا۔ بلکہ وہ ان کو دیانت داری کی تلقین کر رہا تھا۔ اس حوالے سے مقدس پولوس نے ایک وضاحت کی ہے کہ "نیکی، حلم، پرہیز گاری وغیرہ ایسے بنیادی اصول ہیں، جن کی کوئی بھی شریعت مخالفت نہیں کرتی"۔ گویا کہ دنیا میں خواہ کتنی ہی وضعی شرائع ہوں، وہ انہی بدیہی اصولوں پر تشکیل دی جاتی ہیں۔

اعمال کی کتاب میں لوقا نے مقدس پولوس کی تقریر اقتباس کی ہے، جس کے مطابق خدا نے قوموں کی حدیں مقرر کی ہیں، اور ان کی طرف رسول اور پیغمبر بھیجے۔ اگر کوئی قوم اپنی ہی شریعت کو افضل جانتی ہے تو جانے۔ مگر دیانت داری سے اس پر عمل تو کرے۔ کیونکہ اس کی عدالت اس ہی کی شریعت کے مطابق ہو گی۔ دنیا کی ہر قوم خواہ اپنی اپنی شریعت رکھتی ہے۔

تاہم اس شریعت کے بنیادی اصول یکساں ہونے کے باعث انسان کو نیکی و بدی میں امتیاز کروا کر صرف اور صرف خدا کی پسندیدگی کے مقام پر پہنچانے میں معاونت کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یسوع نے سبت کے روز معجزات کر کے بظاہر ایک وضعی اصول کی خلاف ورزی کی۔ لیکن نیکی جیسے بدیہی اصول کی پیروی کی۔

فقیہوں اور فریسیوں نے اعتراض کیا کہ؛ "تیرے شاگرد بغیر ہاتھ دھوئے کھانا کھاتے ہیں، جس سے وہ موسوی شریعت کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوتے ہیں"۔ بے شک فریسیوں کے نزدیک یہ غیر شرعی عمل تھا۔ لیکن یہ وضعی شریعت کا اصول تھا، جو ظاہری پاکیزگی کی علامت تھا۔ مگر یسوع نے سمجھایا کہ اصل پاکیزگی اس ظاہری عمل میں نہیں۔ بلکہ اصل پاکیزگی کو باطنی ہونا چاہئے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے بتا دیا کہ جھوٹ، زنا، چوری، برے منصوبے اصل میں ناپاکی کی علامت ہیں۔ اگر کوئی شخص بظاہر وضعی شریعت پر عمل پیرا ہو، اور بظاہر طہارت کی سبھی رسموں کی تعمیل کرتا ہو، مگر دل میں مذکورہ جذبات رکھتا ہو، تو اس میں پاکیزگی بالکل نہیں۔ بلکہ وہ شخص باطنی طور پر ناپاک ہے۔

مقدس پولوس نے بھی اپنے خطوط میں اسی حوالے سے بعض وضاحتیں پیش کی ہیں۔ اکثر لوگ سمجھتے ہیں کہ مقدس پولوس نے شریعت کی مخالفت کی ہے۔ جیسا کہ اس کے اپنے وقت کے یہودیوں نے سمجھا۔ میں بھی کچھ عرصہ پیشتر تک ایسا ہی سمجھتا تھا۔ لیکن جب یسوع نے مجھ سے کلام کیا تو مجھے بہت سی مشکل باتوں کے سمجھنے میں دقت پیش نہ آئی۔

میرے خیال میں ہر قوم کو خدا نے ہدایت پہنچائی ہے۔ تاکہ روزِ عدالت کو وہ بے گواہ نہ رہے۔ جن قوموں کو اپنی اپنی شریعت و ہدایت کو نافذ کرنے کا موقع ملا، وہ جلد منظم ہو گئیں۔ جیسا کہ بنی اسرائیل۔ باقی اقوام، جن کو کسی بھی طرح سے ہدایت پہنچی، اپنی اپنی شریعت و ہدایت کو کسی بھی شکل میں نافذ العمل کرنے میں کامیاب ہو گئیں، تو خدا نے یہ مقرر کر دیا کہ اگر ان تک "انجیل" نہ بھی پہنچ پائی تو کم از کم ان کا انصاف انہی کی شریعت کے مطابق کیا جائے گا۔ میرے نزدیک انجیل کا مقصد و مدعا بھی یہی ہے کہ انسانوں کو باطنی طور پر "ایمان کی شریعت" کے تحت بدیہی اصولوں کی پیروی کے لئے متحرک کیا جائے۔ عہد نامہِ قدیم میں چند نبوتیں اس حوالے سے قابلِ مطالعہ ہیں، جن میں "دل پر شریعت" کے لکھنے کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ یہ دراصل انسان کے ضمیر، جو "خدا کا چراغ" ہے، کو استعمال کر کے ان اصولوں کی پیروی کی طرف مائل کرنا ہے، جن کی مخالفت کوئی بھی شریعت نہیں کرتی۔ یعنی یہ بنیادی اصولِ حیات ہیں۔ انجیل انہی بنیادی اصولوں کی پیروی پر ابھارتی ہے۔

دنیا میں کوئی مذہب بذاتہٖ برا نہیں۔ وضعی اختلافات کا تعلق اقوام کے طرزِ معاشرت، اور ثقافت کے امتیاز پر منحصر ہے۔ اس کے باوجود ہر مذہب نیکی جیسے بنیادی اصول پر متفق ہیں۔ خدا دراصل اسی اصول کی پیروی کا تقاضا کرتا ہے۔ انجیل اسی کا نام ہے۔ ہر فرد کو انفرادی طور پر خدا کے سامنے جوابدہ ہونا ہے۔ اسے اپنی باطنی شریعت کے تحت حساب دینا ہو گا۔ خواہ وہ وضعی شریعت کے اعتبار سے وجود پذیر ہوئی ہو، خواہ فطری اعتبار سے۔

میں نے اپنی چالیس سالہ زندگی میں اچھے اور برے ہر طرح کے لوگ دیکھے ہیں۔ مسیحیوں میں بھی، اور غیر مسیحیوں میں بھی۔ ہر قوم اور ملک میں بھی ہر دو طرح کے لوگ موجود ہیں۔ یہاں تک کہ نئے عہد نامے میں دو طرح کے انسانوں کا ذکر ہے۔ ایماندار اور غیر ایماندار۔ جو بظاہر ایک جیسے نام رکھتے ہیں۔ ایک جیسی وضع قطع رکھتے ہیں۔ ایک جیسی معاشرت اور عبادت کے تحت پہچانے جاتے ہیں۔ لیکن پھر بھی وہ باطنی طور پر ایک دوسرے کے متضاد ہو سکتے ہیں۔ یسوع نے بتایا تھا کہ کڑوے دانے عام دانوں کے جیسے ہی ہو سکتے ہیں، اور ایک ہی طریقے (Process) کے تحت بڑھتے ہیں۔ لیکن ان کی فطرت میں اختلاف نمایاں ہوتا جاتا ہے۔ جب وہ تیار ہو جاتے ہیں تو پھر ان کو الگ الگ کیا جاتا ہے۔ بہتر دانے استعمال کرنے کے لئے اور کڑوے دانے جلانے یا پھینکے جانے کے لئے۔

خدا نے انسان کو جس پاک فطرت کے تحت پیدا کیا تھا، وہ اسی طرف مراجعت کرے تو وہ آسمان کی بادشاہی کا وارث بننے کا حق حاصل کر سکتا ہے۔ بصورتِ دیگر وہ رد کر دیا جائے گا۔ یسوع خدا کی بادشاہی کا ایسا نمائندہ ہے، جس نے اس پاک فطرت کو ظاہر کر کے انسانوں کی مدد کی ہے کہ وہ بھی آسمان کی بادشاہی میں داخلے کے اہل ہو سکتے ہیں۔ اس اہلیت کے لئے جو بنیادی اصول یسوع نے بتائے ہیں، وہ وضعی شریعت سے مختلف اسلوبِ بیان کے حامل ہیں۔ لیکن وہ کسی بھی وضعی شریعت سے متصادم نہیں ہیں۔ ایک غیر مسیحی بھی ان اصولوں کی پیروی کر سکتا ہے۔ اسی طرح ایک یہودی یا ہندو اور بدھ مت کا پیروکار بھی ان اصولوں کو اپنا سکتا ہے۔ یہ اصول ہر مذہب کی وضعی شریعت میں کسی نہ کسی پیرائے میں بیان ہوئے ہیں۔ ہر شخص اپنے وضعی مذہب و مسلک میں رہتے ہوئے ان بنیادی اصولوں ہی کی پیروی کرتا اور کر سکتا ہے۔

ہمہ گیر اصولِ حیات

یسوع کی شخصیت ہمہ گیر ہے۔ اس کی تعلیم میں ہمہ گیریت پائی جاتی ہے۔ دنیا کا کوئی نظریہ حیات، سائنس، نفسیات، مذہب، اور فلسفہ یا نظامِ عقائد یسوع کی شریعت کو چیلنج نہیں کرتے۔ اگرچہ یسوع کی بعض تعلیمات کو فطرتِ انسانی سے متصادم قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن در حقیقت وہی حیات و کردارِ انسانی کی معراج ہیں۔ میں یہاں چند اقتباسات پیش کرنا چاہتا ہوں، جن کی مدد سے یسوع کی تعلیمات کے اصل جوہر یا روح کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔ ملاحظہ کیجئے؛

"حضرت مسیح نے یہودیوں کی ظاہر پرستیوں اور اخلاقی محرومیوں کی جگہ رحم و محبت اور عفو و بخشش کی اخلاقی قربانیوں پر زور دیا تھا، اور ان کی دعوت کی اصل روح یہی ہے۔ چنانچہ ہم انجیل کے مواعظ میں جابجا اس طرح کے خطابات پاتے ہیں۔ "تم نے سنا ہو گا کہ اگلوں سے کہا گیا، دانت کے بدلے دانت اور آنکھ کے بدلے آنکھ۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ شریر کا مقابلہ نہ

کرو۔" یا "اپنے ہمسائیوں ہی کو بلکہ دشمنوں کو بھی پیار کرو"۔ یا مثلاً "اگر کوئی تمہارے ایک گال پر طمانچہ مارے تو چاہئے کہ دوسرا گال بھی آگے کر دو۔

سوال یہ ہے کہ ان خطابات کی نوعیت کیا تھی؟ یہ اخلاقی فضائل و ایثار کا ایک مؤثر پیرایہ بیان تھا، یا تشریع تھی، یعنی قوانین وضع کرنا تھا؟ افسوس ہے کہ انجیل کے معتقدوں اور نکتہ چینوں دونوں نے یہاں ٹھوکر کھائی۔ دونوں اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ یہ تشریع تھی، اور اس لئے دونوں کو تسلیم کر لینا پڑا کہ یہ ناقابلِ عمل احکام ہیں۔ معتقدوں نے خیال کیا کہ اگرچہ ان احکام پر عمل نہیں کیا جا سکتا، تاہم مسیحیت کے احکام یہی ہیں، اور عملی نقطۂ خیال سے اس قدر کافی ہے کہ اوائلِ عہد میں چند ولیوں اور شہیدوں نے ان پر عمل کر لیا تھا۔ نکتہ چینوں نے کہا کہ یہ سر تا سر ایک نظری اور ناقابلِ عمل تعلیم ہے، اور کہنے میں کتنی ہی خوشنما ہو، لیکن عملی نقطۂ خیال سے اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ یہ فطرتِ انسانی کے صریح خلاف ہے۔

فی الحقیقت نوعِ انسانی کی یہ بڑی ہی درد انگیز ناانصافی ہے، جو تاریخِ انسانیت کے اس عظیم الشان معلم کے ساتھ جائز رکھی گئی۔ جس طرح بے درد نکتہ چینوں نے اسے سمجھنے کی کوشش نہ کی، اسی طرح نادان معتقدوں نے بھی فہم و بصیرت سے انکار کر دیا۔

لیکن کیا کوئی انسان، جو قرآن کی سچائی کا معترف ہو، ایسا خیال کر سکتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیم فطرتِ انسانی کے خلاف تھی، اور اس لئے ناقابلِ عمل تھی؟ ہرگز نہیں۔ قرآن کی تصدیق کے ساتھ ایسا منکرانہ خیال جمع نہیں ہو سکتا۔ اگر ہم ایک لمحہ کے لئے بھی ایسا تسلیم کر لیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیم کی سچائی سے انکار کر دیں۔ کیونکہ جو تعلیم فطرتِ انسانی کے خلاف ہے، وہ کبھی انسان کے لئے سچی تعلیم نہیں ہو سکتی۔ لیکن ایسا اعتقاد نہ صرف قرآن کی روح کے خلاف ہو گا، بلکہ اس کی دعوت کی اصلی بنیاد ہی متزلزل ہو جائے گی۔ اس کی دعوت کا بنیادی اصول یہ ہے کہ وہ دنیا کے تمام رہنماؤں کی یکساں طور پر تصدیق کرتا ہے، اور سب کو خدا کی ایک ہی سچائی کا پیامبر قرار دیتا ہے"۔

(ابو الکلام احمد، ترجمانِ قرآن جلد اول، صفحات 84-85، مطبوعہ جید برقی پریس دہلی، غالباً 1932ء)

"اس موقع پر یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ قرآن نے جس قدر اوصاف خود اپنی نسبت بیان کئے ہیں، پوری فراخ دلی کے ساتھ وہی اوصاف تورات و انجیل کے لئے بھی بیان کئے ہیں۔ مثلاً وہ جس طرح اپنے آپ کو ہدایت کرنے والا، روشنی رکھنے والا، نصیحت کرنے والا، قوموں کا امام، متقیوں کا راہنما، قرار دیتا ہے، ٹھیک اسی طرح پچھلے صحیفوں کو بھی ان تمام اوصاف سے متصف قرار دیتا ہے۔ چنانچہ انجیل کی نسبت ہم جابجا پڑھتے ہیں؛ "(5: 47)۔ یہ ظاہر ہے کہ جو تعلیم فطرتِ بشری کے خلاف اور ناقابلِ عمل ہو، وہ کبھی نور و ہدایت اور موعظہ للمتقین نہیں ہو سکتی۔

اصل یہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی ان تمام تعلیمات کی وہ نوعیت ہی نہ تھی، جو غلطی سے سمجھ لی گئی، اور دنیا میں ہمیشہ انسان کی سب سے بڑی گمراہی اس کے انکار سے نہیں بلکہ کج اندیشانہ اعتراف و اعتقاد ہی سے پیدا ہوئی ہے۔

حضرت مسیح کا ظہور ایک ایسے عہد میں ہوا تھا، جبکہ یہودیوں کا اخلاقی تنزل انتہائی حد تک پہنچ چکا تھا، اور دل کی نیکی اور اخلاق کی پاکیزگی کی جگہ محض ظاہری احکام و رسوم کی پرستش، دینداری و خدا پرستی سمجھی جاتی تھی۔ یہودیوں کے علاوہ جس قدر متمدن قومیں قرب و جوار میں موجود تھیں، مثلاً رومی، مصری، آشوری، وہ بھی انسانی رحم و محبت کی روح سے یکسر نا آشنا تھیں۔ لوگوں نے یہ بات تو معلوم کر لی تھی کہ جرموں گناہوں پر مجرموں کو سزائیں دینی چاہئیں۔ لیکن اس حقیقت سے بے بہرہ تھے کہ رحم و محبت اور عفو و بخشش کی چارہ سازیوں سے جرموں اور گناہوں کی پیدائش روک دینی چاہئے۔ انسانی قتل و ہلاکت کا تماشا دیکھنا، طرح طرح کے ہولناک طریقوں سے مجرموں کو ہلاک کرنا، زندہ انسانوں کو درندوں کے سامنے ڈال دینا، آباد شہروں کو بلاوجہ جلا کر خاکستر کر دینا، اپنی قوم کے علاوہ تمام انسانوں کو غلام سمجھنا اور غلام بنا کر رکھنا، رحم و محبت اور علم و شفقت کی جگہ قلبی قساوت و بے رحمی پر فخر کرنا، رومی تمدن کا اخلاق اور مصری اور آشوری دیوتاؤں کا پسندیدہ طریقہ تھا۔

ضرورت تھی کہ نوعِ انسانی کی ہدایت کے لئے ایک ایسی ہستی مبعوث ہو، جو سر تا سر رحمت و محبت کا پیام ہو، اور جو انسانی زندگی کے تمام گوشوں سے قطع نظر کر کے، صرف اس کی قلبی و معنوی حالت کی اصلاح و تزکیہ پر اپنی تمام پیغمبرانہ ہمت مبذول کر دے۔ چنانچہ حضرت مسیح علیہ السلام کی شخصیت میں وہ ہستی نمودار ہو گئی۔ اس نے جسم کی جگہ روح پر، زبان کی جگہ دل پر، اور ظاہر کی جگہ باطن پر نوعِ انسانی کو توجہ دلائی، اور انسانیتِ اعلیٰ کا فراموش شدہ سبق تازہ کر دیا۔

معمولی سے معمولی کلام بھی، بشرطیکہ بلیغ ہو، اپنی بلاغت کے مجازات رکھتا ہے۔ قدرتی طور پر اس الہامی بلاغت کے بھی مجازات تھے، جو اس کی تاثیر کا زیور اور اس کی دلنشینی کی خوبروئی ہیں۔ لیکن افسوس کہ وہ دنیا، جو اقانیمِ ثلاثہ اور کفارہ جیسے دور از کار عقائد پیدا کر لینے والی تھی، ان کے مواعظ کا مقصد و محل نہ سمجھ سکی، اور مجازات کو حقیقت سمجھ کر غلط فہمیوں کا شکار ہو گئی۔

انہوں نے جہاں کہیں یہ کہا ہے کہ "دشمنوں کو پیار کرو"، تو یقیناً اس کا یہ مطلب نہ تھا کہ ہر انسان کو چاہئے کہ اپنے دشمنوں کا عاشقِ زار ہو جائے۔ بلکہ سیدھا سا مطلب یہ تھا کہ تم میں غیظ و غضب اور نفرت و انتقام کی جگہ رحم و محبت کا پر جوش جذبہ پیدا ہونا چاہئے، اور ایسا ہونا چاہئے کہ دوست تو دوست، دشمن تک کے بھی ساتھ عفو و درگزر سے پیش آؤ۔ اس مطلب کے لئے کہ رحم کرو، بخش دو، انتقام کے پیچھے نہ پڑو، یہ ایک نہایت ہی بلیغ اور مؤثر پیرایہ بیان ہے کہ "دشمنوں کو پیار کرو"۔ ایک ایسے گرد و پیش میں، جہاں اپنوں عزیزوں کے ساتھ بھی رحم کا محبت کا برتاؤ نہ کیا جاتا ہو، یہ کہنا کہ اپنے دشمنوں سے بھی نفرت نہ کرو، رحم و محبت کی ضرورت کا ایک اعلیٰ اور کامل ترین تخیل پیدا کر دینا تھا۔

یا مثلاً اگر انہوں نے یہ کہا "اگر کوئی تمہارے ایک گال پر طمانچہ مارے تو دوسرا گال بھی آگے کر دو"، تو یقیناً اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ سچ مچ کو تم اپنا گال آگے کر دیا کرو۔ بلکہ صریح مطلب یہ تھا کہ انتقام کی جگہ عفو و درگزر کی راہ اختیار کرو۔ بلاغتِ کلام کے یہ مجازات ہیں، جو ہر زبان میں یکساں طور پر پائے جاتے ہیں، اور یہ ہمیشہ بڑی ہی جہالت اور نادانی کی بات سمجھی

جاتی ہے کہ ان کے مقصود و مفہوم کی جگہ ان کے منطوق پر زور دیا جائے۔ اگر ہم اس طرح کے مجازات کو ان کے ظواہر پر محمول کرنے لگیں گے، تو نہ صرف تمام الہامی تعلیمات ہی درہم برہم ہو جائیں گی، بلکہ انسان کا وہ تمام کلام، جو ادب و بلاغت کے ساتھ دنیا کی تمام زبانوں میں کہا گیا ہے، یک قلم مختل ہو جائے گا۔

باقی رہی یہ بات کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے سزا کی جگہ محض رحم و درگزر ہی پر زور دیا، تو ان کے مواعظ کی اصلی نوعیت سمجھ لینے کے بعد یہ بات بھی بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ بلاشبہ شرائع نے تعزیز و عقوبت کا حکم دیا تھا، لیکن اس لئے نہیں کہ تعزیز و عقوبت فی نفسہٖ کوئی مستحسن عمل ہے۔ بلکہ اس لئے کہ معیشتِ انسانی کی بعض ناگزیر حالتوں کے لئے یہ ایک ناگزیر علاج ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ایک کم درجہ کی برائی تھی، جو اس لئے گوارا کر لی گئی کہ بڑے درجے کی برائیاں روکی جا سکیں۔ لیکن دنیا نے اسے علاج کی جگی ایک دلچسپ مشغلہ بنا لیا۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ رفتہ رفتہ انسان کی تعذیب و ہلاکت کا ایک خوفناک آلہ بن گئی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی قتل و غارت گری کی کوئی ہولناکی ایسی نہیں ہے، جو شریعت اور قانون کے نام سے نہ کی گئی ہو، اور جو فی الحقیقت اسی بدلہ لینے اور سزا دینے کے حکم کا ظالمانہ استعمال نہ ہو۔ اگر تاریخ سے پوچھا جائے کہ انسانی ہلاکت کی سب سے بڑی قوتیں میدان ہائے جنگ سے باہر کون کون سی رہی ہیں، تو یقیناً اس کی انگلیاں ان عدالت گاہوں کی طرف اٹھ جائیں گی، جو مذہب اور قانون کے ناموں سے قائم کی گئیں، اور جنہوں نے ہمیشہ اپنے ہم جنسوں کی تعذیب و ہلاکت کا عمل اس کی ساری وحشت انگیزیوں اور ہولناکیوں کے ساتھ جاری رکھا۔ پس اگر حضرت مسیح علیہ السلام نے تعزیر و عقوبت کی جگہ سر تا سر رحم و درگزر پر زور دیا، تو یہ اس لئے نہیں تھا کہ وہ نفسِ تعزیز و سزا کے خلاف کوئی نئی تشریع کرنا چاہتے تھے۔ بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ اس ہولناک غلطی سے انسان کو نجات دلائیں، جس میں تعزیز و عقوبت کے غلو نے مبتلا کر رکھا ہے۔ وہ دنیا کو بتلانا چاہتے تھے کہ اعمالِ انسانی میں اصلِ عمل رحم و محبت ہے، نفرت و انتقام نہیں"۔

"شریعتِ موسوی کے پیروؤں نے شریعت کو صرف سزا دینے کا آلہ بنا لیا تھا۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے بتلایا کہ شریعت سزا دینے کے لئے نہیں بلکہ نجات کی راہ دکھانے آتی ہے، اور نجات کی راہ سر تا سر رحمت و محبت کی راہ ہے"۔

(ایضاً صفحات 86-88)

"یقیناً انہون نے اس بات پر زور دیا ہے کہ گناہ سے نفرت کرو، لیکن یہ کبھی نہیں کہا کہ گناہگار سے نفرت کرو۔ اس کی مثال ایسی ہے، جیسے ایک طبیب ہمیشہ لوگوں کو بیماریوں سے ڈراتا رہتا ہے، اور بسا اوقات ان کے مہلک نتائج کا ایسا ہولناک نقشہ کھینچ دیتا ہے کہ دیکھنے والے سہم کر رہ جاتے ہیں۔ لیکن یہ تو کبھی نہیں کرتا کہ جو لوگ بیمار ہو جائیں، ان سے ڈرنے اور نفرت کرنے لگے۔ یا لوگوں سے کہے کہ ڈرو اور نفرت کرو۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس کی تو ساری توجہ اور شفقت کا مرکز بیمار ہی کا وجود ہوتا ہے۔ جو انسان جتنا زیادہ بیمار ہو گا، اتنا ہی زیادہ اس کی توجہ اور شفقت کا مستحق ہو جائے گا۔

پس جس طرح جسم کا طبیب بیماریوں کے لئے نفرت لیکن بیمار کے لئے شفقت و ہمدردی کی تلقین کرتا ہے، ٹھیک اسی طرح روح و دل کے طبیب بھی گناہوں کے لئے نفرت لیکن گنہگاروں کے لئے سر تا سر رحمت و شفقت کا پیام ہوتے ہیں۔ یقیناً وہ چاہتے ہیں کہ گناہوں سے (جو روح و دل کی بیماریاں ہیں) ہم میں دہشت و نفرت پیدا کر دیں، لیکن گناہوں سے پیدا کر دیں، گناہگار انسانوں سے نہیں، اور یہی وہ نازک مقام ہے، جہاں ہمیشہ پیروانِ مذاہب نے ٹھوکر کھائی ہے۔ مذاہب نے چاہا تھا کہ انہیں برائی سے نفرت کرنا سکھلائیں۔ لیکن برائی سے نفرت کی جگہ انہوں نے ان انسانوں سے نفرت کرنا سیکھ لیا، جنہیں وہ اپنے خیال میں برائی کا مجرم تصور کرتے ہیں۔

حضرت مسیح کی تعلیم سر تا سر اسی حقیقت کی دعوت تھی۔ گناہون سے نفرت کرو، مگر ان انسانوں سے نفرت نہ کرو، جو گناہوں میں مبتلا ہو گئے ہیں"۔

(ایضاً صفحہ نمبر 89)

سطورِ بالا میں جس امر پر زور دے دے کر وضاحت کی گئی ہے، اس کا مقصود و مطلوب یہی ہے کہ انسان کے اندر خوابیدہ جوہر شریعت کو بیدار کیا جائے، جس کے لئے خدائے عزوجل نے اسے تخلیق کیا تھا۔ انسان اپنے ہم جنس کے ساتھ "اپنی مانند محبت" رکھنے ہی سے ایک پر امن اور جرم و گناہ سے پاک زندگی کا مظاہرہ کر سکتا ہے۔ یسوع کے بقول ساری شریعت کا خلاصہ یہی ہے کہ "اپنے پڑوسی سے اپنی مانند محبت رکھو"۔ نیز اس نے کہا کہ؛ "اس سے زیادہ محبت کوئی نہیں کرتا کہ اپنے دوستوں (ہم جنسوں) کے لئے اپنی جان دے دے"۔ لہٰذا یسوع نے اسی پہلو کو اپنی زندگی سے ظاہر کیا، اور تمام شریعت کی تکمیل کر دی۔

میں نے دانستہ و نادانستہ بہت سی خطائیں کی ہیں۔ میں نے یقیناً بہت سے ہم جنسوں کو خفا و رنجیدہ کیا ہے۔ مجھے بھی معافی کی ضرورت ہے۔ لیکن اس سے پیشتر کہ کوئی مجھے معاف کرے، مجھے بھی ان کے ساتھ وہی کرنا چاہئے، جس کی توقع میں اپنے لئے کرتا ہوں۔ جب 1998ء میں مجھے پولیس نے شدید تشدد کا نشانہ بنایا تو میرے دل میں انتقام کی چنگاری بھڑک اٹھی۔ میں نے چاہا کہ جن منشیات فروشوں کی وجہ سے یہ دلخراش واقعہ رونما ہوا، اور اس کے ردِ عمل کے نتائج مجھ سمیت متعدد لوگوں نے بھگتے، ان منشیات فروشوں کو ضرور ہی کیفرِ کردار تک پہنچنا چاہئے۔ اس جذبہ انتقام نے مجھے اپنی زندگی کے حقیقی مقاصد سے بہت دور لا کھڑا کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ مخالفت کے بدلے میں مخالفت و مزاحمت دونوں سر اٹھانے لگی ہیں، جس سے میں اپنی راہ سے ہٹنے لگا ہوں۔

میں اس بات کے لئے آسمانی باپ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے یسوع مسیح کو مجھ پر ظاہر کر کے، مجھے رجوع لانے کا موقع بخشا ہے۔ میں اپنی طرف سے اپنے تمام دشمنوں، بد خواہوں، اور ستانے والوں کو دل سے معاف کرتا ہوں، اور اپنے

آسمانی باپ سے اور ان تمام ہم جنسوں سے معافی کا خواستگار ہوتا ہوں، جن کو میری طرف سے کسی بھی قسم کی تکلیف یا پریشانی اٹھانا پڑی ہے۔ میں اس بات کے لئے بھی دعا گو ہوں کہ ربِ ذوالجلال ہم تمام انسانوں کو یسوع کے انجیلی اصولِ شریعت پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

ختم شُد